اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ
اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا○

کلامِ خدا

فضائلِ محمد و آل محمد علیھم السلام
منتخب آیات کی روشنی میں

از

پروفیسر علامہ غلام صابر

ایسوسی ایٹ انجینئر، فاضل عربی، سلطان الافاضل، الواعظ
بی ایڈ، ایم اے اسلامیات، ایم اے انگلش (پنجاب یونیورسٹی)

مصباح الدجیٰ یونیورسٹی نیاز بیگ (ٹھوکر) لاہور
website: www.mu.edu.pk E-Mail: misbahudduja@yahoo.com
Ph: 042-6127790 # 0300-7473505 # 0332-7473505

کتاب ---------- کلام خدا

تأ لیف ---------- پروفیسر غلام صابر

کمپوزنگ ---------- فروا بتول دوگل، سیدہ صدف نقوی،

سیدہ نجف نقوی، کلثوم اعوان، زیر نگرانی: شمسہ زہراء

کمپیوٹر انجینئرز -------- چوہدری ضیغم علی، شوذب علی، شواب علی

پروف ریڈنگ -------- سید مظہر حسین کاظمی

تاریخ اشاعت ------ 12 دسمبر 2011ء

تعداد ---------- 1100

ہدیہ ----------

پیغام

کیا ہم نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان پر غور وفکر کے ساتھ ساتھ عمل بھی کیا ہے تا کہ ہمیں دنیا و آخرت میں فتح وکامرانی نصیب ہو!

يَنۡبَغِي لِلۡمُؤۡمِنِ اَنۡ لَا يَمُوۡتَ

مومن کے لیے ضروری ہے کہ اس دنیا سے اس حالت میں جائے

حَتّٰى يَتَعَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ اَوۡ يَكُوۡنَ فِيۡ تَعَلُّمِهِ

کہ قرآن سیکھ چکا ہو یا قرآن سیکھ رہا ہو۔

آغا سید سیّدین موسوی

چانسلر مصباح الدجیٰ یونیورسٹی

﴾ہدیۂ تشکّر﴿

ہم ممنون ہیں کینڈا میں مصباح الدجیٰ یونیورسٹی کی کوآرڈی نیٹر محترمہ مکرمہ امبر فاطمہ جعفری صاحبہ کے جن کی دینی اورقومی گراں قدر خدمات لائق تحسین ہیں۔ علوم محمد وآل محمد علیہم السلام کی ترویج وترقی کے لیے مصباح الدجیٰ یونیورسٹی کے پروگرامز اور کتب کی طباعت اور اشاعت میں جن کی معاونت قابل رشک ہے۔ یقیناً ان کے اس کارِعظیم کا کریڈٹ ان کے والدین اور خصوصاً ان کے خاوند جناب عزّت مآب سید علی کامران جعفری کو جاتا ہے۔

ہم شکریہ ادا کرتے ہیں گرامیٔ قدر جناب اخلاق حسین اعوان صاحب آف راولپنڈی، کینڈا میں مقیم جناب قابل قدر سید عروج رضا جعفری صاحب، جناب محترم ظاہر لہڑی صاحب اور دیگر مؤمنین ومؤمنات کے جنہوں نے اس کتاب کی طباعت میں اپنا حصّہ ڈالا۔

خداوندمتعال صدقۂ چہاردہ معصومین علیہم السلام ان سب کے رزق میں وسعت وبرکت عطا فرمائے اور انہیں سوائے غمِ حضرت امام حسین علیہ السلام کوئی غم نہ دے۔ ان تمام شخصیات کے مرحومین خصوصاً سید ضامن علی جعفری ولد سید شاکر حسین جعفری، ثمانہ خاتون بنت سبط احمد جعفری، عبدالغفور لہڑی اور سعدیہ حسین لہڑی بنت طارق حسین لہڑی کو جنت فردوس اور جوار آئمہ اطہارؑ میں اعلی مقام عطا فرمائے۔

پروفیسر غلام صابر

وائس چانسلر مصباح الدجیٰ یونیورسٹی

پیش لفظ

اس کاوش کا مقصد نئی نسل کو قرآن کی روشنی میں فضائل محمد وآل محمد علیھم السلام سے آگاہ کرنا ہے۔ یہ بھی واضح کرنا ہے کہ بارگاہ ایزدی میں یہ ہستیاں کس مقام اور عزّت و احترام کی حامل ہیں کہ ہر مسلمان کے لیے نماز میں ان پر درود بھیجنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ قرآن اور اہل بیتؑ لازم وملزوم ہیں۔ جب تک ہم ان دونوں کو اپنا رہنما بنائے رکھیں گے دین ودنیا میں کامیاب وکامران رہیں گے۔

اس تالیف میں ہم نے معتبر اہل سنت اور شیعہ تفاسیر، احادیث اور تواریخ کی کتب سے استفادہ کیا۔ اتحاد بین المسلمین کے پیش نظر اختلافی باتوں سے گریز کیا۔ صرف اور صرف تعلیمات محمد وآل محمدؐ اور ان کی معرفت کے جواہرات کی ایک جھلک آپ کے حضور پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ مصباح الدجیٰ یونیورسٹی کے اس تعلیمی پروگرام کی ترقی اور بہتری کے لیے آپ کی تجاویز اور آراء ہمارے پیش نظر رہیں گی۔

ہم علامہ محمد یونس قمی صاحب کے شکر گزار ہیں جنہوں نے عربی عبارت پر اعراب لگانے کی خدمت سرانجام دی۔ مصباح الدجیٰ یونیورسٹی کی طالبات سلویا بتول، سیدہ انعم بتول نقوی، سیدہ سماریہ بتول رضوی، سیدہ خانم بتول ہمدانی، فوزیہ کرامت اور علیہ زینب جنہوں نے کمپوزنگ کے بقیہ مراحل کی تکمیل میں حصّہ لیا۔ ربّ العزت صدقۂ چہاردہ معصومینؑ انہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ان کے دامن ترقی وکامرانی سے بھردے۔

پروفیسر غلام صابر

آیت تطہیر سے آئمہؑ کے معصوم ہونے میں تسلسل اور دوام کا ثابت ہونا۔
زیارت جامعہ کی روشنی میں عصمت کا مفہوم۔
کیا یہ اللہ کا عدل ہے کوئی خلقت سے ہی معصوم اور کوئی غیر معصوم۔
آئمہؑ کی عصمت سے عام مخلوق کو کیا فائدہ۔

2. آیت مباہلہ فَقُلْ تعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَ اَبْنَآئَکُمْ .... صفحہ 36
مباہلہ کا معنی اور مفہوم۔
حق کے اثبات کے طریقے۔
مباہلہ میں ایک ایک آدمی کافی تھا مگر بیٹوں، بیٹیوں اور نفوس کی شرکت کیوں۔
آیت مباہلہ میں کاذبین کا لفظ ہے اہل بیتؑ صادقین کیسے ثابت ہوئے۔
کیا میدان مباہلہ میں جانے والی ہستیوں کی ترتیب قرآنی تھی۔
میدان مباہلہ میں حضرت فاطمہؑ کے درمیان میں ہونے سے مراد۔
روایات کی روشنی میں مباہلہ کی تفصیل۔
آیت مباہلہ عظمت اہل بیتؑ کی ایک زندہ سند۔
اَبْنَاءَ، نِسَاءَ اور اَنْفُسَ جمع ہیں ان سے حسنؑ، حسینؑ، فاطمہؑ اور علیؑ کس طرح مراد ہیں
''نساء'' کا معنی عورتیں ہے آیت میں بیٹی کس طرح مراد لے سکتے ہیں۔
نفسِ رسولؐ ہونے سے علیؑ کی خلافت بلافصل کا ثبوت۔
حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کا ہارون رشید سے مکالمہ۔
حضرت امام علی رضاؑ اور مامون رشید کا مکالمہ۔

3. آیت مودّت قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا .... صفحہ 59

شان نزول۔

آیت مودّت سے آئمہ معصومینؑ کی پیشوائی اور رہبری کی دلیل۔

پیغمبر اکرمؐ نے اجر رسالت کیوں مانگا۔

مودّت فی القربیٰ کے سلسلے میں مشہور تفاسیر۔

قرآن مجید میں القربیٰ کا معنی۔

سنی اور شیعہ کتب کی روشنی میں قربیٰ سے مراد۔

تفسیر کشاف میں مقام آل محمد علیہم السلام۔

آل محمدؑ کی مودّت واجب جبکہ باقی انبیاءؑ کی آل کو یہ سعادت نہ ملی کیوں۔

آیت مودّت اہل سنت وشیعہ مفسرین کی نظر میں۔

مودّت اہل بیتؑ رسالت کا جز ہے۔ ثبوت قرآن کی روشنی میں۔

4. آیت درود اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ...... صفحہ 92

صلات کی نسبت اگر اللہ، فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو معنی میں فرق۔

حضورؐ کے لیے ہم سے درود کا مطالبہ کس لئے ہے۔

تفسیر صافی میں ''صلواۃ'' کا معنی۔

کیا درود کے بغیر دعا قبول ہو سکتی ہے۔

درود پڑھنے کا ثواب۔

''یصلون'' کے فعل مضارع ہونے سے مراد۔

''صلوا'' اور ''سلموا'' میں فرق۔

کیا حضرت محمدؐ پر درود بھیجتے وقت آل محمدؐ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔
درود کی روایات میں لفظ ''عَلٰی'' کا فاصلہ نہ ہونے کی وجہ۔
دم بریدہ (دم کٹا) درود سے کیا مراد۔
فقہاء کے نزدیک نماز کے تشہد میں درود پڑھنے کا حکم۔
نماز میں اہل بیتؑ پر درود نہ بھیجنا امام شافعیؒ کی نظر میں۔
کیا اصحابؓ اور ازواجؓ بھی درود میں شامل ہیں۔

5. آیت خلافت اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً .... صفحہ 104
حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا مقصد۔
قرآن مجید کی روشنی میں لفظ ''خلیفہ'' کی وضاحت۔
اللہ نے حضرت آدمؑ کو کس کا خلیفہ قرار دیا مفسرین کی آراء۔
خلافت الٰہیہ کی حقدار کون سی ہستیاں ہیں۔
کیا واقعی حضرت آدمؑ کی خلافت پر فرشتے معترض تھے۔
فرشتوں نے کیسے گمان کیا کہ انسان فساد کرے گا۔
کیا فرشتے زمین پر خلافت کے خود بھی امیدوار تھے۔
اللہ نے حضرت آدمؑ کو کن اسماء کی تعلیم دی۔
کیا خلافت حضرت آدمؑ تک ہی مخصوص تھی یا یہ عہدہ قیامت تک کے لیے تھا
خدا نے حضرت آدمؑ کو کس طرح اسماء کی تعلیم دی۔
کیا یہ عدل ہے کہ آدمؑ کو اسماء کی تعلیم دی فرشتوں کو نہیں دی۔
آیت میں ھُمْ (اسمائھم) اور ھٰؤُلَاءِ کے الفاظ کی دلالت۔

فہرست

1. آیت تطہیر اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ .... صفحہ 15

کلمہ "اِنَّمَا" سے مراد۔

آیت میں لفظ "یُرِیْدُ" پروردگار کے کس ارادہ کی طرف اشارہ ہے۔

ارادہ تکوینی اور ارادہ تشریعی سے کیا مراد ہے۔

لفظ "اَلرِّجْس" میں الف لام کس معنی پر دلالت کرتا ہے۔

تطہیر کا معنی اور مفہوم ۔

مفسرین نے اہل بیت پیغمبرؐ سے کون سی ہستیاں مراد لیں۔

آیت تطہیر سے قبل و بعد ازواجؓ کا ذکر ہے پھر اہل بیت سے مراد ازواج کیوں نہیں

"اذھاب رجس" سے مراد رجس کو دور کرنا یا رجس سے دور رکھنا ہے۔

آیت تطہیر کن افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اللہ کا کون سا ارادہ عالم تکوین میں خدا کی مشیت سے تعلق رکھتا ہے۔

اللہ نے کب سے آئمہؑ کو رجس سے دور رکھا۔

جب اللہ نے خود ہی آئمہؑ سے رجس کو دور رکھا پھر اس میں آئمہؑ کی کیا فضیلت ہے۔

کیا اللہ کا ارادہ تکوینی ایک قسم کے جبر کا نام نہیں ہے۔

مقام عصمت یا معصوم سے مراد۔

آیت تطہیر میں بیت کے لفظ سے مراد کس کا گھر۔

آیت تطہیر میں ارادہ الٰہی سے مراد حلال و حرام کے احکام کیوں نہیں۔

6. آیت امامت اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا .... صفحہ 133

آیت امامت میں "کلمات" سے مراد۔

حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات۔

کیا عہدہ امامت سے مراد نبوت ہے۔

امامت اور "اِیۡصَالُ اِلَی الۡمَطۡلُوۡبِ" سے مراد۔

نبوت، رسالت اور امامت میں فرق۔

عہدہ امامت حضرت ابراہیمؑ کی آخری سیر تکامل۔

ظلم سے مراد اور لَا یَنَالُ عَھۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ کی وضاحت۔

قرآن کی روشنی میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت۔

امام کا تعین کس طرف سے۔

7. آیت ولایت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ .... صفحہ 156

شان نزول۔

لفظ "اِنَّمَا" کا معنی اور مفہوم۔

ولایت علیؑ کے متعلق حسان بن ثابتؓ کے اشعار۔

"اَلَّذِیۡنَ" جمع کا صیغہ ہے۔ کیا اس سے واحد مراد لیا جاسکتا ہے۔

لفظ "ولی" کا معنی۔

"خدا بالذات ولی مطلق ہے" سے مراد۔

"رسولؐ اور مومنین (آئمہؑ) بالعرض ولی مطلق ہیں" سے مراد۔

8. آیت اولی الامر اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ .... صفحہ 177

اولوالامر کے تعین کے سلسلے میں مفسرین کی آراء۔

اولوالامر کی صفات۔

کیا فخر الدین رازی امام کو معصوم سمجھتے ہیں۔

رسالت مآبؐ کے زمانے میں اولوالامر کون تھے۔

احادیث کی روشنی میں حضورؐ نے کن ہستیوں کو اولوالامر قرار دیا۔

"خدا بالذات واجب الاطاعت" سے مراد۔

"پیغمبرؐ بالغیر واجب الاطاعت ہیں" سے مراد۔

اس زمانے میں اولوالامر۔

9. آیت بیّنہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ .... صفحہ 196

"مَنْ" کا مفہوم۔ شَاهِدٌ سے مراد۔

شَاهِدٌ مِنْهُ میں لفظ مِنْهُ سے مراد۔

آیت بینہ کی حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر دلالت۔

10. آیت عالم الکتاب قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ .... صفحہ 212

شہادت کا معنی۔

حضورؐ کی رسالت کے دو گواہ۔

تحمل شہادت اور ادائے شہادت سے مراد۔

آیت عالم الکتاب کی حضرت علیؑ کی خلافت پر دلالت۔

اَلَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ اور مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ میں فرق۔

11. آیت تبلیغ یَآَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ .... صفحہ 220

وہ کون سا پیغام تھا جس کا نہ پہنچانا رسالت کا نہ پہنچانا تھا۔

شان نزول اور واقعہ غدیر کا خلاصہ۔

حضرت علیؑ کی ولایت کے اعلان پر صحابہؓ کی مبارک باد۔

اعلان غدیر پر حسان بن ثابتؓ کا قصیدہ۔

کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے۔

آیت تبلیغ کی حضرت علیؑ کی ولایت پر دلالت۔

حدیث غدیر اور صحاح ستہ۔

حدیث غدیر سے حضرت علیؑ کا اپنی خلافت پر استدلال۔

آخری جملے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی ..." کا مفہوم۔

کیا ایک زمانے میں دو ولی ہو سکتے ہیں۔

12. آیت اکمال الدین اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ .... صفحہ 252

"اَلْیَوْمَ" سے کونسا دن مراد ہے اور اس کے متعلق مفسرین کی آراء۔

آیت کے دو جملوں میں کون سے چار پہلو بیان ہوئے ہیں۔

سورۃ نور کی آیت وَعَدَ اللّٰہُ... میں تین وعدے کب پورے ہوئے۔

واقعہ غدیر کے متعلق دونوں آیات یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ...

اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ... کے درمیان فاصلہ کیوں ہے۔

کیا دین کی تکمیل حضرت علیؑ کی ولایت کے اعلان سے ہوئی۔

آیت اکمال الدین کا شان نزول کتاب "المراجعات" کی روشنی میں۔

شان نزول میں مفسرین کا اختلاف۔

حضرت علیؑ کی ولایت کے اعلان کے فوراً بعد حضورؐ نے کیا دعا کی۔

13. آیت رویت اعمال وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰه۔۔ صفحہ 267
ہمارے اعمال کو اللہ کے علاوہ رسولؐ اور مؤمنین بھی دیکھتے ہیں۔
ہمارے کہنے کے بغیر ہی امامؑ ہمارے لیے دعا فرماتے ہیں۔
آیت رویت اعمال میں ''مؤمنون'' سے مراد۔
تمام اعمال آئمہ طاہرینؑ کے سامنے پیش ہونے سے مراد۔
کیا رویت اعمال کی روایات ایک دوسری کے منافی ہیں۔
جملہ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ سے مراد اعمال کی آگاہی ہے یا جزا۔
کیا آیت میں رویت دیکھنے کے معنی میں ہے۔
''عنقریب خدا اعمال دیکھے گا'' سے مراد۔

14. آیت وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ۔ صفحہ 279
حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے شیعہ تھے۔
حضور اکرمؐ کو حضرت ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا۔
مِنْ شِيْعَتِهٖ میں ''ھو'' کی ضمیر کا مرجع آذر نہیں بلکہ حضرت نوحؑ ہیں۔
حضرت ابراہیمؑ نے عرش کے پہلو میں کن ہستوں کے انوار کو دیکھا۔
حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی ''اے اللہ: مجھے علیؑ کا شیعہ قرار دے۔''
قرآن میں 11 مقامات میں لفظ شیعہ کا استعمال۔
گزشتہ انبیاءؑ کی امتیں شیعہ کہلاتی تھیں۔
حضرت موسیٰؑ نے اپنے شیعہ کے دشمن کو قتل کر دیا۔
شیعہ کے لغوی اور اصطلاحی معانی قرآن وحدیث اور لغت کی نظر میں۔
محبان حضرت علیؑ کے لیے لفظ شیعہ کے موجد اور بانی حضرت محمدؐ ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت شیعہ لقب سے مشہور تھی۔

کیا اہل سنت والجماعت بھی پہلے شیعہ لقب سے مشہور تھے۔

روز قیامت صرف شیعہ فرقہ ہی نجات یافتہ ہوگا۔

قرآن کے الفاظ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

شیعہ اور محبّ میں فرق۔

1

آیت تطہیر

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَہْلَ الْبَیْتِ وَیُطَہِّرَکُمْ تَطْہِیْرًا o

(سورۃ الاحزاب33 آیت33 پارہ22)

ترجمہ: خدا تو یہی ارادہ کرتا ہے کہ ہر قسم کے رجس کو تم اہل بیتؑ سے دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک رکھے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔

تفسیر

''اِنَّـمَا '' کا لفظ عام طور پر ''حصر'' کے لئے آتا ہے۔ حصر سے مراد ''ضَیَّقَ عَلَیْہِ ، اَحَاطَ بِہٖ تنگی کرنا، گیر لینا، احاطہ کرنا'' کے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نعمت خاندان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اور اس میں شامل نہیں ہے۔

لفظ ''یُرِیْدُ'' پروردگار کے ارادۂ تکوینی کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ ارادۂ تشریعی اہل بیت پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا۔ بلکہ سب لوگ بغیر کسی استثناء کے حکم شریعت کے تحت اس بات کے پابند ہیں کہ وہ ہر قسم کے گناہوں اور نجاستوں سے پاک رہیں۔ ضروری ہے کہ اللہ کے ارادۂ تشریعی اور ارادۂ تکوینی کا معنی سمجھ لیا جائے۔

ارادۂ تشریعی:

اس کا تعلق بندے کے عمل سے یعنی بندے کے فعل سے ہے۔ لہٰذا خدا کا وہ ارادہ جس میں وہ اپنے بندے سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ بعض کاموں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو بجالائے اور بعض سے باز رہے یعنی گناہ وغیرہ سے۔ ارادۂ تشریعی کہلاتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے اوامر و نواہی [1] کا نام ارادۂ تشریعی ہے۔

[1] اوامر جمع ہے امر کی اور نواہی جمع ہے نہی کی۔ معنی: نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔

ارادۂ تکوینی:

اس کا تعلق بندے کے فعل سے نہیں بلکہ خدا کے فعل سے ہے۔قرآن کہتا ہے: خدا نے ارادہ کیا ہے کہ تم اہل بیتؑ سے ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو دور رکھے۔اس بنا پر خدا کے اس ارادے کو ارادۂ تکوینی کہتے ہیں۔اس کا تعلق عالم تکوین میں خدا کی مشیّت سے ہے۔گویا ارادہ تکوینی خلقت و پیدائش کے معنی میں ہے۔لہٰذا اہل بیتؑ اپنی خلقت اور پیدائش سے ہی طاہر و مطہر ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ ارادۂ تکوینی ایک قسم کے جبر کا نام ہے وہ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے ہی ان سے رجس کو دور کر دیا ہے اور انہیں طاہر و مطہر بنا دیا ہے تو پھر طاہر و مطہر ہونا ان ہستیوں کا کوئی اعزاز نہیں ہے۔

یہ واضح رہے کہ اہل بیتؑ سے رجس کو دور رکھنا اور انہیں طاہر و مطہر رکھنا مقام عصمت کہلاتا ہے اور یہی مقام عصمت تقوائے الٰہی کی ایک حالت کا نام ہے جسے پروردگار انبیاءؑ و آئمہؑ میں پیدا کرتا ہے لیکن اس حالت یعنی مقام عصمت کے عطا کیے جانے کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ وہ گناہ نہ کر سکیں بلکہ وہ گناہ پر قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود گناہ کی طرف نہیں جاتے۔

بالکل اس ماہر طبیب کی مانند جو کسی زہریلی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا کیونکہ وہ اس کے خطرات کو جانتا ہے۔اگرچہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی بصیرت اور فکری و روحانی صلاحیتیں اسے اس کام سے دور رکھتی ہیں۔اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی عقل مند قطعاً تیار نہیں ہوگا کہ آگ کا انگارہ اپنے منہ میں رکھ لے حالانکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ خدائی تقویٰ اس کا خاص عطیہ اور نعمت ہے جو اس نے انبیاءؑ و مرسلینؑ اور آئمہ اطہارؑ کو عطا فرمایا ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کو۔

یہ واضح رہے کہ خدا نے یہ اعزاز انہیں رہبری اور قیادت کی بھاری ذمہ داری نبھانے کی بناء پر عطا فرمایا ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے اور یہ عین عدالت ہے۔ بالکل اس خاص امتیاز کے مانند جو خدا نے آنکھ کے نازک اور بہت ہی حساس پردوں کو دیا ہے۔ جن سے سارا بدن فائدہ اٹھاتا ہے۔ بہر حال انبیاءؑ اور آئمہؑ جس قدر اعزازات رکھتے ہیں اور پروردگار کی عنایات ان کے شامل حال ہیں۔ اسی قدر ان کی ذمہ داری بھی سخت ہوتی ہے اور ان کا ایک ترک اولیٰ عام افراد کے ایک عظیم گناہ کے برابر شمار ہوتا ہے۔ یہی امر عدالت الٰہی کو واضح کرتا ہے۔

مختصر یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارادہ مقتضی صورت میں ارادۂ تکوینی ہے (نہ کہ علت تامہ) اور اس کے باوجود نہ تو جبر ہے اور نہ ہی اعزاز کو سلب کرتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ اہل بیتؑ کو طاہر و مطہر ہونے اور ہر قسم کی ناپاکی سے دور رہنے کی نعمت کب سے دی گئی؟

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے: اہل بیتؑ کی اس نعمت کا تعلق اللہ کے ارادۂ تکوینی سے ہے۔ اللہ چونکہ قدیم ہے اور ارادہ اس کے صفات ثبوتیہ میں سے ہے اور اس کے صفات عینِ ذات ہیں۔ اس بنا پر اس کا ارادہ بھی قدیم ہونے کے منافی نہیں ہے۔ پس جب سے اللہ کے ارادہ تکوینیہ کا تعلق ان کی ایجاد سے ہو رہا تھا اور ان کا نور زیورِ تخلیق سے آراستہ ہو کر باعث ایجاد کائنات بن رہا تھا۔ تب سے ارادۂ خداوندی ان سے رجس کی دوری اور طہارت سے آراستگی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جب سے ہیں طاہر و مطہر ہیں اور رجس و عیب سے پاک و پاکیزہ ہیں۔

لفظ "رجس" ناپاک شئ کے معنی میں ہے خواہ وہ انسان کے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے ناپاک ہو یا حکم عقلی کی وجہ سے یا شریعت کی رو سے یا ان سب وجوہ کے اعتبار

سے۔(راغب نے کتاب المفردات میں رجس کے مادہ میں معنی اوراس کے چار قسم کے مصداق کو بیان کیا ہے)

بعض نے رجس سے گناہ، شرک، بخل وحسد یا باطل اعتقاد وغیرہ مراد لیا ہے تو درحقیقت یہ اس کے مصادیق کا بیان ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم عام اور وسیع ہے اور ہر قسم کی نجاست اس کے معنی میں شامل ہے کیونکہ الف لام یہاں جنس پر دلالت کرتا ہے۔

آیت تطہیر عصمت کی واضح دلیل:

بعض مفسرین ''رجس'' کو آیت میں صرف شرک یا زنا جیسے گناہان کبیرہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ اس محدودیت کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ ''الرجس'' [1] کا ''اطلاق'' ہر قسم کی ناپاکی اور گناہ کا مفہوم لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ ہر گناہ ''رجس'' ہے اسی لئے یہ لفظ قرآن میں شرک، الکحل والے مشروبات، جوا، نفاق، حرام وناپاک گوشت اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے معنی میں آیا ہے۔ [2]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جب خدا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کے پورا نہ ہونے کا کوئی امکان موجود نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں پورا ہوتا ہے اور ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ '' کا جملہ اس کے حتمی ارادہ پر دلیل ہے خصوصاً ''انما'' کا لفظ جو حصر اور تاکید کے لیے ہے سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ اہل بیتؑ ہر قسم کے رجس ونجاست اور گناہ سے پاک ہوں اور اسی چیز کا نام عصمت ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ الٰہی سے مراد حلال وحرام کے احکام وفرامین نہیں ہیں کیونکہ یہ احکام تو سب کے لیے ہیں صرف اہل بیتؑ سے مخصوص نہیں ہو

[1] اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا الف ولام جنس کے لئے ہے [2] سورہ حج آیت ۳۰، مائدہ آیت ۹۰، توبہ آیت ۱۲۵، انعام آیت ۱۴۵

سکتے اور نہ ہی ''انما'' کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں۔

پس یہ مسلسل اور متواتر ارادہ جو کہ ''یُرِیْدُ''فعل مضارع کی خاصیت سے بھی ظاہر ہے ایک قسم کی خدائی امداد کی طرف اشارہ ہے جو اہل بیتؑ کی عصمت اور اس کے دوام وتسلسل کے لیے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ارادہ واختیار کی آزادی کے بھی منافی نہیں ہے حقیقت میں آیت کا مفہوم وہی ہے جو''زیارت جامعہ''میں آیا ہے۔

''عَصَمَكُمُ اللّٰهُ مِنَ الزَّلَلِ وَاٰمَنَكُمْ مِّنَ الْفِتَنِ وَ طَهَّرَ كُمْ مِّنَ الدَّنَسِ وَاَذْهَبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ وَطَهَّرَكُمْ تَطْهِيْرًا'' ''خدا نے لغزشوں سے تمہاری حفاظت کی اور انحراف وکج روی کے فتنے سے امان میں رکھا اور آلودگیوں سے پاک رکھا۔تم سے ہر قسم کی ناپاکیوں اور نجاستوں کو دور رکھا اور جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے تمہیں پاک رکھا''

اس وضاحت کے بعد اوپر والی آیت کے عصمت اہل بیتؑ پر دلالت کرنے میں شک وتردد نہیں کرنا چاہیے۔

اذھابِ رجس:

اس کا معنی دفع رجس بھی کیا گیا ہے۔دفع رجس کا معنی ہے پاک رکھنا جبکہ رفع رجس کا معنی ہے پاک کرنا۔

پس رفع رجس (پاک کرنا) وہاں ہوتا ہے جہاں پہلے رجس ہو اور دفع رجس وہاں ہوتا ہے جہاں پہلے رجس نہ ہو۔اس جگہ آیت مجیدہ میں اذہاب کا معنی رفع رجس (رجس کا دور کرنا) نہیں ہے۔کیونکہ اس سے لازم آئے گا کہ پہلے رجس تھا اور پھر رفع کیا گیا اور یہ عصمت کے خلاف ہے بلکہ اس جگہ مراد دفع رجس (رجس کا دور رکھنا) ہے یعنی پاک تھے اور ان کو پاک رکھا گیا اور اس کے کئی وجوہ ہیں۔

یہ وجہ مطلب کی تائید کے لیے ہے نہ کہ اثبات کے لیے۔حضرت ابراہیمؑ کو

بیت اللہ کی تعمیر کے بعد حکم ہوا ''اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ '' کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک رکھو ۱
چونکہ اللہ کو کعبہ کی پاکیزگی مطلوب تھی اس لیے اپنے خلیل کو اس کی تطہیر کا حکم دیا اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب خلیل کو تطہیر کا حکم ہو رہا تھا اس سے پہلے بھی بیت اللہ طاہر و پاکیزہ تھا کیونکہ اس کی تعمیر میں کسی کافر و مشرک و نجس کا ہاتھ شامل نہ تھا۔ وہاں تطہیر کا معنی پاک کرنا نہ تھا بلکہ پاک رکھنا تھا۔ اسی مناسبت سے کہ قرآن کا بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے اس جگہ بھی تطہیر سے مراد پاک رکھنا ہے نہ کہ پاک کرنا کیونکہ جب اس نے ان کو خلق فرمایا تو پاکیزہ خلق کیا اور اس کے بعد جب ہمیشہ کے لیے ان کی پاکیزگی خدا کو مطلوب تھی تو ان کو ہر قسم کے رجس سے پاک رکھا جس طرح پاک رکھنے کا حق تھا۔

'' تطهيرًا '' سے مراد پاک رکھنا ہے۔ حقیقت میں نجاستوں اور ناپاکیوں کو دور رکھنے کے بارے میں تاکید ہے۔ نیز اس کا مفعول مطلق کی شکل میں ہونا یہاں اس معنی کی ایک اور تاکید شمار ہوتی ہے۔

''اہل بیتؑ'' کے متعلق تمام علماء اسلام اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اہل بیتؑ کی طرف اشارہ ہے۔ یہی بات خود آیت کے ظاہر سے بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ ''بیت'' اگرچہ یہاں مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے سے اس سے مراد پیغمبرؐ کا بیت اور گھر ہے۔ ۲

۱ البقرہ آیت 125 ۲ بعض نے بیت کو یہاں بیت الحرام اور کعبہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس کے اہل متقی افراد کو شمار کو کیا ہے یہ بات آیت کے سیاق سے بہت ہی غیر مناسب ہے کیونکہ یہاں گفتگو پیغمبر اکرم اور ان کے گھر کے بارے میں ہے نہ کہ بیت الحرام کے متعلق اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے۔

''اہل بیت پیغمبرؐ '' سے مراد کون لوگ ہیں؟

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔بعض اسے ازواج پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور قبل وبعد کی آیات کو جو ازواج کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس کا قرینہ قرار دیتے ہیں۔

اس نظریے کی نفی یوں ہوتی ہے کہ اگر ذرا سی توجہ کی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ ضمیریں (قَرْنَ، بُیُوتِکُنَّ، لَاتَبَرَّجْنَ، اَقِمْنَ، اٰتِیْنَ، اَطِعْنَ، اُذْکُرْنَ) جو قبل وبعد کی آیات میں آئی ہیں سب کی سب جمع مونث کی شکل میں ہیں ۔جبکہ آیت کے اس حصے کی سب ضمیریں (لِیُذْھِبَ عَنْکُمْ، یُطَھِّرَکُمْ) جمع مذکر کی شکل میں ہیں اور یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ یہاں کوئی دوسرا معنی مراد ہے۔

بعض مفسرین نے اس سے وسیع تر نظریہ اختیار کرتے ہوئے آیت میں پیغمبر اکرمؐ کے سارے خاندان کو شامل سمجھا ہے۔چاہے وہ مرد ہوں یا آپؐ کی بیویاں۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ بہت زیادہ روایات جو اہل سنت اور شیعہ منابع ومصادر میں وارد ہوئی ہیں ایک اور معنی دیتی ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سارے خاندان کے شمول کی نفی کرتے ہوئے واضح کرتی ہیں کہ اس آیت میں مخاطب صرف پانچ افراد ہیں یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام۔

تو اس قدر وافر مقدار میں نصوص [1] کے ہوتے ہوئے جو آیت کے مفہوم کی تفسیر کے لئے روشن وواضح قرینہ ہیں اس آیت کے لئے قابل قبول تفسیر وہی تیسرا معنی ہے یعنی آیت ''خمسہ طیبہ'' کے لیے مخصوص ہے۔

[1] نص کی جمع معنی: حکم قطعی

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی ازواج کی ذمہ داریوں کے ذکر کے بیچ میں یہ بات کیونکر آ گئی ہے کہ جس میں پیغمبرؐ کی بیویاں شامل نہیں ہیں؟

اس کا جواب بزرگ مفسر مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس طرح دیتے ہیں:

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ آیاتِ قرآن میں ہم ایسی آیات کا سامنا کر رہے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود مختلف موضوعات کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح فصحاء عرب کے کلام واشعار میں بھی اس کے وافر نمونے ملتے ہیں۔

تفسیر المیزان کے عظیم مؤلف نے اس پر ایک اور جواب کا اضافہ کیا ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ ... '' کا جملہ ان آیات کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ بلکہ روایات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ علیحدہ نازل ہوا ہے۔ ممکن ہے پیغمبر اکرمؐ کے دور میں آیات قرآن کی جمع آوری کے موقع پر یا اس کے بعد ان آیات کے ساتھ قرار دیا گیا ہو۔

اس میں ایک لطیف نکتہ بھی ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں سے کہے کہ تمہاری نسبت ایک ایسے گھرانے سے ہو گئی ہے جس کے افراد معصوم ہیں تو جو کوئی شجر عصمت کے سائے میں اور معصومینؑ کے مرکز میں ہو۔ وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ دوسروں کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ خبردار ہو اور اس بات کو نہ بھول جائے کہ جس کی نسبت ایسے خاندان سے ہو کہ جس میں پانچ معصوم ہستیاں موجود ہیں۔ اس کی ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں۔ خدا اور خلق خدا اس سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہے۔

آیت تطہیر کن افراد کے بارے میں ہے؟

یہ آیت اگرچہ ان آیات کے درمیان آئی ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی ازواج سے مربوط ہیں لیکن اس کے سیاق کی تبدیلی (''جمع مونث'' کی ضمائر کو''جمع مذکر''میں تبدیل کرنا) اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مضمون ان آیات سے بالکل الگ ہے۔

اس بناء پر ان لوگوں کا نظریہ بھی درست نہیں جو آیت کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام سے مخصوص نہیں سمجھتے۔ اس کے لئے وسیع معنی کے قائل ہیں کہ آیت ان بزرگواروں کے بارے میں بھی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں بھی۔

ہمارے پاس بہت سی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت صرف ان بزرگواروں کے ساتھ مخصوص ہے اور ازواج پیغمبرؐ اس میں داخل نہیں ہیں اگرچہ شایان شان احترام کے لائق ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے چھ روایات قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

(الف) کچھ روایات وہ ہیں جو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے نقل ہوئی ہیں اور بتاتی ہیں کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت شریفہ کے بارے میں بات کرتے تو ہم آپؐ سے سوال کرتیں کہ ہم بھی اس کا مخاطب ہیں تو آپؐ فرماتے کہ تم اچھی تو ہو لیکن اس میں شامل نہیں ہو۔

ان میں سے ایک روایت ثعلبی نے اپنی تفسیر میں جناب ''ام سلمہؓ'' سے نقل کی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اپنے گھر میں تھے کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام ریشمی کپڑا لائیں تو رسول اللہؐ نے فرمایا اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں حسنؑ، حسینؑ کو بلاؤ۔ فاطمہؑ انہیں بھی لائیں۔ پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ان پر عبا ڈال دی اور کہا:

"اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَھلَ بَیتِیْ وَ عِترَتِیْ فَاذْھَبْ عَنْھُمُ الرِّجسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا" خداوندا یہ میرے اہل بیتؑ ہیں اور میری عترت ہیں ان سے ہر قسم کی نجاست دور رکھ اور انہیں پاک رکھ جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔ اس موقع پر آیت "انما یرید اللّٰہ" نازل ہوئی۔ میں نے کہا کیا میں بھی آپ کے ساتھ ہوں اے رسولؐ خدا؟ فرمایا اِنَّکِ عَلٰی خَیْرٍ " تو نیکی پر ہے" لیکن ان افراد میں شامل نہیں ہے۔

نیز ثعلبی حضرت عائشہؓ سے یوں نقل کرتے ہیں۔ جس وقت بی بی عائشہؓ سے جنگ جمل اور اس تباہ کن جنگ میں ان کے عمل دخل کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو (انھوں نے افسوس کے ساتھ) کہا یہ ایک تقدیر خداوندی تھی اور جب ان سے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں سوال ہوا تو کہا:

"تَسْئَلُنِیْ عَنْ اَحَبِّ النَّاسِ کَانَ اِلیٰ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَزَوْجٌ اَحَبُّ النَّاسِ، کَانَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ لَقَدْ رَاءَ یْتُ عَلِیّاً وَ فَاطِمَۃَ وَ حَسَناً وَ حُسَیْنًا عَلَیْھِمُ السَّلَامُ وَ جَمَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ بِثَوْبٍ عَلَیْھِمْ ثُمَّ قَالَ: اَللّٰھُمَّ ھٰؤُ لَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ وَ حَآمَّتِیْ فَاذْھَبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَ طَھِّرْھُمْ تَطْھِیْراً، قَالَتْ، فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَنَا مِنْ اَھْلِکَ قَالَ تَنَحّیْ فَاِنَّکِ اِلیٰ خَیْرٍ [1]" "کیا مجھ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھتے ہو جو رسولؐ اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب اور آنحضرتؐ کے نزدیک محبوب ترین خاتون کے شوہر تھے۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت حسن علیہ السلام، حضرت حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایک کپڑے کے نیچے جمع کیا اور فرمایا: خداوندا! یہ میرے اہل بیتؑ اور میرے حامی و مددگار ہیں ان سے ہر قسم کے رجس کو

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

دور رکھ اور انہیں آلودگیوں سے ایسا پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہوتا ہے۔" میں نے عرض کی: یارسولؐ اللہ! کیا میں بھی آپ کے اہل بیتؑ میں سے ہوں؟ فرمایا: پیچھے ہٹو! تم خیر پر ضرور ہو لیکن ان میں شامل نہیں ہو۔

اس قسم کی روایات وضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اس آیت میں ازواج رسولؐ اہل بیتؑ کا جز نہیں ہیں۔

(ب) حدیث کساء کے بارے میں بہت سی روایات اجمالی طور پر وارد ہوئی ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت حسن علیہ السلام، حضرت حسین علیہ السلام کو بلایا یا وہ حضرات خود آپؐ کی خدمت میں آئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اوپر عبا ڈالی اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: "خداوندا! یہ میرے اہل بیتؑ ہیں ان سے ہر قسم کی رجس و آلودگی کو دور رکھ"۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ "**انما یرید اللہ لیذھب ....**"

مشہور عالم حاکم حسکانی نیشاپوری نے "شواہد التنزیل جلد 2 صفحہ 31" میں ان روایات کو متعدد طرق[1] سے نقل کیا ہے اور مختلف راویوں سے جمع کیا ہے۔

یہاں پر یہ سوال توجہ طلب ہے کہ آخر اہل بیتؑ کو کساء کے نیچے جمع کرنے کا مقصد کیا تھا؟

جواباً عرض ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے اپنے اہل بیتؑ کو مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز کر دیں اور بتا دیں کہ یہ آیت صرف انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام گھروں اور ان تمام افراد کو جو آپؐ کے خاندان میں تھے اس آیت کا مصداق سمجھ لے۔حتیٰ کہ بعض روایات میں آیا ہے

[1] طُرُق: طریق کی جمع ہے معنی راستہ۔

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا:

"اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ وَخَاصَّتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَ طَھِّرْ ھُمْ تَطْھِیْرًا" خداوندا! میرے اہل بیتؑ یہی ہیں۔ان سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھ۔[1]

(ج) بہت سی دوسری روایات میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ ماہ تک جب بھی صبح کی نماز کے وقت حضرت فاطمہ علیہا السلام کے گھر کے پاس سے گزرتے تو پکار کر کہتے:

"اَلصَّلٰوۃُ یَا اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا" نماز کا وقت ہے اے اہل بیتؑ! خدا چاہتا ہے کہ ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو تم اہل بیتؑ سے دور رکھے اور تمہیں ویسا ہی پاک رکھے جیسے پاک رکھنے کا حق ہے۔" اس حدیث کو حاکم حسکانی نے انس بن مالکؓ سے نقل کیا ہے۔[2]

ایک اور روایت میں ابو سعید خدریؓ کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے یہ سلسلہ آٹھ یا نو ماہ تک جاری رکھا۔[3]

مذکورہ بالا حدیث کو ابن عباسؓ نے بھی آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔[4]

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت کا تکرار چھ، آٹھ یا نو ماہ تک مسلسل حضرت فاطمہ علیہا السلام کے گھر کے پاس اس بناء پر ہے تاکہ یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جائے اور آئندہ کسی شخص کے لئے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے کہ یہ آیت صرف انہی ذوات مقدسہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔جن کے گھر کا صدر دروازہ مسجد نبوی میں اس وقت بھی کھلتا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے دوسروں کے دروازے مسجد کی طرف بند کر

[1] تفسیر در منثور آیت زیر بحث کے ذیل میں　[2]، [3] شواہد التنزیل جلد 2 صفحہ 28،29

[4] تفسیر در منثور آیت زیر بحث کے ذیل میں

دیے گئے تھے۔ فطری بات ہے کہ بہت سے افراد ہمیشہ نماز کے وقت یہ بات وہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتے تھے۔

مقام تعجب ہے اس کے باوجود بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور ازواج رسولؐ بھی اس میں شامل ہیں۔ جبکہ علماء اسلام کی اکثریت خواہ وہ شیعہ ہوں یا اہل سنت اسے پنجتنؑ ہی میں محدود سمجھتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر یہ آیت ازواج کے لیے بھی ہوتی تو زوجہ رسولؐ جناب عائشہؓ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کسی نہ کسی مناسب موقع پر اس کا اظہار ضرور کیا ہوتا کیونکہ روایات کے مطابق انھوں نے اپنے فضائل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے رابطے کو بیان کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ جبکہ اس سلسلہ میں ان سے کسی قسم کی کوئی چیز روایت نہیں ہوئی۔

(د) رسولؐ اللہ کے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو صراحت کے ساتھ گواہی دیتی ہیں:

" نَزَلَتْ فِیْ خَمْسَةٍ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ عَلِیٍّ وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِؑ " یہ روایت صرف انہی پاک ہستیوں رسول اللہ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [1]

یہ روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض محققین انہیں متواتر جانتے ہیں۔

جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس کا مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احادیث کے مآخذ اور راوی جو آیت کو صرف پنجتن پاکؑ میں منحصر سمجھتے ہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اس میں

[1] شواہد التنزیل جلد 2 صفحہ 25

شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ یہاں تک کہ ”احقاق الحق“ کی شرح میں ستر سے زیادہ احادیث اہل سنت کی مشہور کتابوں میں جمع کی گئی ہیں اور شیعی ماخذ میں تو ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ [1]

کتاب ”شواہد التنزیل“ کے مؤلف نے جو برادران اہل سنت کے مشہور علماء میں سے ہیں اس سلسلہ میں 130 احادیث نقل کی ہیں۔ [2]

ان سب امور سے قطع نظر بعض ازواج پیغمبرؐ نے اپنی زندگی کے دوران ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جو ہرگز مقام عصمت کے لائق نہیں مثلاً جنگ جمل کا واقعہ امام وقت کے خلاف قیام تھا اور زبردست خون ریزی کا سبب بنا۔ بعض مورخین کے بقول اس جنگ میں 17 ہزار افراد مارے گئے۔

حضرت عائشہؓ کا اسلام کی بزرگ ترین اور بافضیلت ترین خاتون جناب خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام پر تنقید کرنا تاریخ اسلام کے سینے میں اب تک محفوظ ہے۔ یہ عیب جوئی اسلام کے گرامی قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر ناگوار گزری کہ شدت غضب سے آپؐ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ”خدا کی قسم مجھے اس سے بہتر بیوی نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت ایمان لائیں جب باقی لوگ کافر تھے اور اس وقت سارا مال میرے سپرد کر دیا جب سب لوگ مجھ سے کٹے ہوئے تھے۔“ [3]

[1] احقاق الحق جلد 2 اور اس کے حواشی کی طرف رجوع کریں۔

[2] شواہد التنزیل جلد 2 صفحہ 10 سے لے کر صفحہ 92 تک رجوع کریں۔ [3] صحیح بخاری اور صحیح مسلم، المراجعات صفحہ 229 خط 72 کے مطابق

خلاصہ

☆ اِنَّمَا کلمہ حصر ہے اس سے مراد احاطہ کرنا ہے۔

☆ ''یُرِیْدُ'' پروردگار کے ارادۂ تکوینی کی طرف اشارہ ہے نہ کہ تشریعی کی طرف۔

ارادۂ تشریعی :

اس کا تعلق بندے کے عمل سے یعنی بندے کے فعل سے ہے۔ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے اوامر ونواہی کا نام ارادہ تشریعی ہے۔

ارادۂ تکوینی:

اس کا تعلق بندہ کے فعل سے نہیں بلکہ خدا کے فعل سے ہے جو عالم تکوین میں خدا کی مشیت سے مربوط ہے۔گویا ارادہ تکوینی خلقت و پیدائش کے معنی میں ہے۔

☆ اللہ چونکہ قدیم ہے اور ارادہ اس کی صفات ثبوتیہ میں سے ہے اور اس کی صفات عین ذات ہے۔اسی بنا پر اس کا ارادہ بھی قدیم ہوا۔لہٰذا جب سے خدا نے ان ہستیوں کے نور کی تخلیق کا ارادہ کیا تب سے ان کو رجس سے دور رکھا اور انہیں طہارت سے آراستہ کیا۔

☆ ارادۂ تکوینی سے جبر و اکراہ مراد نہیں ہے اور نہ ہی اس سے مراد اعزاز و فضیلت کا سلب ہونا ہے۔

☆ رجس کا مفہوم عام اور وسیع ہے۔ ہر قسم کی نجاست اس کے معنی میں شامل ہے کیونکہ الف لام یہاں جنس پر دلالت کرتا ہے۔

☆ آیت میں اہل بیتؑ سے مراد پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ کی طرف اشارہ ہے۔

☆ اہل بیتِ پیغمبرؐ میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے:

(i) اس سے مراد صرف اور صرف ازواج پیغمبرؐ ہیں کیونکہ قبل و بعد کی آیات ازواجؓ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

(ii) بعض مفسرین نے آیت میں پیغمبرؐ کے سارے خاندان کو شامل سمجھا ہے چاہے وہ مرد ہوں یا آپؐ کی بیویاں۔

(iii) بعض کا خیال ہے کہ اہل بیتؑ پیغمبرؐ میں ازواج بھی شامل ہیں۔

پہلے نظریے کی نفی یوں ہوتی ہے کہ وہ ضمیریں جو قبل و بعد کی آیات میں آئی ہیں سب کی سب جمع مونث کی شکل میں آئی ہیں۔ جب کہ آیت کے اس حصے کی سب ضمیریں جمع مذکر کی شکل میں ہیں۔

دوسرے نظریے کے حامل مفسرین کی نفی یوں ہو جاتی ہے کہ بہت زیادہ روایات جو اہل سنت اور شیعہ منابع و مصادر میں وارد ہوئی ہیں وہ پیغمبر اکرمؐ کے سارے خاندان کے شامل ہونے کی نفی کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس آیت میں مخاطب صرف پانچ افراد ہیں۔

تیسرے نظریے کے حامل مفسرین کا جواب دو طرح دیا جا سکتا ہے:

(i) قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے کہ ایک ہی موضوع کی آیات کے درمیان میں ایک مختلف موضوع کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔

(ii) ازواج پیغمبرؐ کے متعلق آیات کے درمیان میں آیت تطہیر کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ازواجؓ اور آلؑ کی شان کا فرق واضح ہو سکے۔

☆ خدا جب ارادہ کر لیتا ہے تو اس کا پورا ہونا حتمی اور یقینی ہوتا ہے اور انما یرید اللہ .... کا جملہ اس کے حتمی ارادہ پر دلیل ہے خصوصاً انما حصر اور تاکید کے لیے ہے کہ اہل بیتؑ ہر قسم کے رجس و نجاست اور گناہ سے پاک ہوں اور اسی چیز کا نام عصمت ہے۔

☆ ارادہ الٰہی سے مراد حلال و حرام کے احکام نہیں ہیں کیونکہ یہ احکام تو سب کے لیے ہیں اور صرف اہل بیتؑ سے مخصوص نہیں ہیں۔

☆ اہل بیتؑ کی عصمت کے متعلق اللہ کے ارادے انّما یُرِیدُ اللّٰہُ میں تسلسل اور دوام پایا جاتا ہے۔ تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل بیتؑ کی معصومیت کسی خاص وقت یا مقام کے لیے نہیں بلکہ آپؑ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معصوم تھے، ہیں اور رہیں گے۔

☆ زیارت جامعہ میں آپ کی عصمت کو واضح بیان کیا گیا ہے: "عَصَمَکُمُ اللّٰہُ مِنَ الزَّلَلِ وَاٰمَنَکُمْ مِّنَ الْفِتَنِ، وَ طَھَّرَکُمْ مِّنَ الدَّنَسِ، وَاَذْھَبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ، وَطَھَّرَکُمْ تَطْھِیْرًا"

☆ "اذھاب رجس" کا معنی رفع رجس (یعنی پاک کرنا) نہیں ہے بلکہ دفع رجس (یعنی پاک رکھنا) کے ہیں۔ پہلے بھی پاک تھے اور ہمیشہ پاک رہیں گے جیسا کہ قرآن میں "ان طھرا بیتی" سے مراد پاک رکھنا ہے۔

☆ بہت سی روایات میں وارد ہوا ہے کہ آیت تطہیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، حضرت علی علیہ السلام ، حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا ، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کے متعلق ہے۔

☆ بعض ازواج پیغمبرؐ نے اپنی زندگی کے دوران ایسے کارنامے سرانجام دیے جو کہ ہرگز مقام عصمت کے لائق نہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ و مرسلینؑ اور آئمہؑ اطہار کو مقام عصمت رہبری اور قیادت کی بھاری ذمہ داری نبھانے کی بناپر عطا فرمایا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے اور یہ عین عدالت ہے۔

خود آزمائی

1. کلمہ ''انما'' سے کیا مراد ہے اور اس آیت میں یہ کس بات کی دلیل ہے؟
2. آیت میں لفظ ''یرید'' پروردگار کے کس ارادہ کی طرف اشارہ ہے؟
3. ارادہ تکوینی اور ارادہ تشریعی کی وضاحت کریں؟
4. ''الرجس'' کا معنی بیان کریں اور واضح کریں کہ الف لام کس معنی پر دلالت کرتا ہے؟
5. تطہیر کا معنی اور مفہوم بیان کریں؟
6. مفسرین نے اہل بیت پیغمبرؐ سے مراد کون سی ہستیاں لی ہیں آپ کے خیال میں کون سی تفسیر درست ہے؟
7. آیت کے اس جملے (اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا) سے پہلے اور بعد میں ازواج رسولؐ کا ذکر ہے تو پھر درمیان کے اس جملے میں اہل بیت رسولؐ سے مراد آپ کی ازواج کیوں نہیں ہیں؟
8. آیت تطہیر اہل بیت رسولؐ کی عصمت کی واضح دلیل ہے وضاحت کریں؟
9. کیا ''اذھاب رجس'' سے مراد رجس کو دور کرنا ہے یا رجس سے دور رکھنا ہے؟
10. قرآن میں ''ان طھرا بیتی'' سے مراد گھر کو پاک کرنا ہے یا پاک رکھنا ہے نیز پاک رکھنا اور پاک کرنا کے فرق کی وضاحت کریں؟

11. آیت تطہیر کن افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے دو روایات کا حوالہ دیں؟

12. جب اللہ کے ارادے سے بندے کا فعل مراد نہ ہو بلکہ خدا کا اپنا فعل مراد ہو تو یہ کون سا ارادہ کہلاتا ہے؟

13. اللہ کا کون سا ارادہ عالم تکوین میں خدا کی مشیت سے تعلق رکھتا ہے؟

14. اللہ نے کب سے آئمہؑ کو رجس سے دور رکھا اور انہیں طہارت سے آراستہ کیا نیز اللہ کے ارادے کے قدیم ہونے کی وضاحت کریں؟

15. جب اللہ نے خود ہی آئمہؑ سے رجس کو دور رکھا اور انہیں طاہر و مطہر بنا دیا تو پھر ان ہستیوں کا معصوم ہونا کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ وضاحت کریں؟

16. کیا ارادہ تکوینی ایک قسم کے جبر کا نام نہیں ہے؟

17. مقام عصمت یا معصوم کسے کہتے ہیں؟

18. آئمہؑ مقام عصمت پر فائز ہونے کے باوجود گناہ نہیں کرتے مثالوں سے واضح کریں؟

19. آپ کیسے ثابت کریں گے کہ آیت تطہیر میں بیت کے لفظ سے مراد پیغمبرؐ کا گھر ہے؟

20. آیت تطہیر میں ارادہ الٰہی سے مراد حلال و حرام کے احکام کیوں نہیں؟

21. کیا اہل بیتؑ کسی مخصوص وقت کے لیے ہی مقام عصمت پر فائز ہوتے ہیں؟

22. اہل بیتؑ کی عصمت کے متعلق اللہ کے ارادئے میں تسلسل اور دوام پایا جاتا ہے یہ معنی آیت تطہیر کے کس لفظ سے ثابت ہے؟

23. زیارت جامعہ کے الفاظ بیان کریں جن سے آئمہؑ کا معصوم ہونا ثابت ہے؟

24. اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ و مرسلینؑ اور آئمہؑ اطہار کو مقام عصمت عطا فرمایا۔ کیا یہ اللہ کے عدل کے خلاف نہیں ہے کہ کوئی تو پیدا ہوتے ہی معصوم ہو اور کوئی گنہگار؟

25. آئمہؑ کی عصمت سے عام مخلوق کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟

2

آیت مباہلہ

فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ کَ
مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ کُمْ
وَ نِسَآءَ نَا وَ نِسَآءَ کُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ قف
ثُمَّ نَبْتَھِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ o

(سورۃ آل عمران 3 آیت 61 پارہ 3)

ترجمہ: پھر جب تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا اس کے بعد بھی اگر کوئی حضرت عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑے تو کہہ دو (میدان میں آؤ) ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ اس کے بعد ہم سب مل کر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔

تفسیر

مباہلہ:

"مباہلہ" دراصل "بھل" کے مادہ سے ہے۔اس کا معنی ہے "رہا کرنا، کسی کی قید وبند کو ختم کردینا"۔ اسی بنا پر جب کسی جانور کو اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اس کے پستان کسی تھیلی میں نہ باندھیں تا کہ اس کا نوزائیدہ بچہ آزادی سے اس کا دودھ پی سکے تو اسے "بـاھل" کہتے ہیں۔دعا میں "ابتھـال" گڑگڑا کر دعا کرنا اور کام خدا کے سپرد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔کبھی کبھار یہ لفظ ہلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کے معنی میں اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔لغت کے لحاظ سے یہ مباہلہ کا مفہوم ہے۔

لیکن اس مروج مفہوم کے لحاظ سے جو اوپر والی آیت میں مراد لیا گیا ہے یہ دو اشخاص کے درمیان ایک دوسرے پر نفرت کا اظہار کرنے کو کہتے ہیں۔وہ بھی اس طرح کہ دو گروہ جو کسی اہم مذہبی مسئلے میں اختلاف رائے رکھتے ہوں ایک جگہ جمع ہو جائیں بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو ذلیل ورسوا کرے اور اسے سزا وعذاب دے۔

فَقُلْ تَعَالَوْا : حق کے اثبات کے لیے دو طریقے تھے۔

(i) دلیل وبرہان (ii) استجابت دعا (قبولیت دعا)۔

چونکہ پہلا طریقہ استعمال کرنے کے بعد جب معلوم ہوا کہ وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔لہٰذا دوسرے طریقہ کی ان کو دعوت دی گئی کہ وہ آپس میں مباہلہ کریں یعنی ایک دوسرے کے

لیے ہلاکت کی اللہ سے دعا مانگیں پس جھوٹا ہلاک و برباد ہو جائے گا۔

اس آیت میں غور کرنے سے چند چیزیں بخوبی سمجھ میں آتی ہیں:

(i) مباہلہ میں طرفین سے ایک ایک آدمی کافی تھا لیکن اپنے دعویٰ پر انتہائی اطمینان و وثوق ثابت کرنے کے لیے اَبۡنَآءُ (بیٹے)، نِسَآءُ (عورتیں) اور اَنۡفُسٌ (نفوس) کو دعائے ہلاکت میں شریک کیا گیا۔ آیت کا لب ولہجہ بتلاتا ہے کہ ابناء، نساء اور انفس سے مراد وہ نفوس ہیں جو اصل دعویٰ میں مدعی کے ساتھ شریک ہوں۔ صرف دونوں طرف سے کثرت کی خاطر مزید بھرتی کر کے لانا مقصود نہیں تھا۔

ظاہر ہے نصاریٰ کی طرف سے جو زن و مرد اس میں شرکت کرتے وہ صرف وہی ہو سکتے تھے جو دل و جان سے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت (معبود ہونے) کے مدعی تھے تاکہ اس مباہلہ میں اپنی جانوں پر کھیل جانا آسان سمجھتے۔

دوسری طرف سے جو زن و مرد نصاریٰ کے مقابلے میں جائیں وہ وہی ہونے چاہییں جن کو حضرت عیسیٰؑ کے عبد اور مخلوق خدا ہونے کا یقینِ کامل ہو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دعویٰ مذکورہ میں شریک اور دعوت اسلام میں بھی ان کے ساتھ حصہ دار ہوں۔

(ii) جو ہستیاں اس دعویٰ کو منوانے کے لیے میدان میں اتریں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ دعوتِ اسلام میں اور حضرت عیسیٰ ؑ کے عبد ہونے کے دعویٰ (یعنی دعویٰ عبدیت) میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ برابر کی شریک ہوں چنانچہ آیت کے اختتام میں کَاذِبِیۡنَ جمع کا صیغہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جانے والے صَادِقِیۡنَ تھے اگر دعوتِ نصاریٰ کے علمبردار اور مدعی صرف آپ ہی ہوتے اور ساتھ جانے والے افراد کی حیثیت گواہ کی سی ہوتی تو کاذبین جمع کا صیغہ نہ لایا جاتا۔ کیونکہ نصاریٰ کی نگاہوں میں اگر (معاذ اللہ) کاذبین تھے تو سب کے سب جانے

والے تھے اور خدا کے علم میں اگر صادقین تھے تو بھی سب جانے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ نصاریٰ کی نظروں میں بھی یہ سب کے سب دعوت دہندہ اور مدعی عبدیت حضرت عیسیٰؑ تھے اور اللہ کے نزدیک بھی یہ تمام ہستیاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک تھیں۔

(iii) اَنۡفُسٌ جمع ہے نَفۡسٌ کی ۱؎ قرآنی الفاظ بتلاتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس میدان اور اس دعوت میں ان مردوں کو شریک کرنے کا حکم تھا جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یگانگت اور یکجہتی اس طرح ہو جس طرح جسم سے نفس کی نسبت ہوا کرتی ہے اور وہ شخص ہی ساتھ جانے کا اہل ہو سکتا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بمنزلہ نفس ہو جمع کے صیغہ سے خطاب کے باوجود صرف حضرت علی علیہ السلام کا انتخاب اس امر کی دلیل ہے کہ صحابہ رسولؐ میں سے جان نثاری اور وفا شعاری کے لحاظ سے دوسرا کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا جس کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نفس کی حیثیت سے مباہلہ میں لے جاتے۔ پس یہی آیت حضرت علی علیہ السلام کی جملہ صحابہؓ بلکہ باقی تمام انبیاءؑ سے بھی افضل ہونے کی نصِ صریح (واضح سند) ہے۔

نفس اور شے کا حکم ایک ہوا کرتا ہے لہٰذا جن لوگوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت ثابت ہوگی انہی پر رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت بھی ثابت ہوگی۔ اسی سے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا:

یَاعَلِیُّ اَنۡتَ مِنِّی وَاَنَا مِنۡکَ جِسۡمُکَ جِسۡمِیۡ دَمُکَ دَمِیۡ رُوۡحُکَ رُوۡحِیۡ ۲؎ قرآن کے لفظ اَنۡفُسَنَا کی تفسیر ہے۔

۱؎ نَفۡسٌ سے مراد روح، خون۔ کہا جاتا ہے جَآءَ نِیۡ هُوَ نَفۡسُهٗ وَبِنَفۡسِهٖ یعنی وہ خود ہی آیا۔ نَفۡسُ الۡاَمۡرِ حقیقت امر۔ ۲؎ اے علیؑ آپ مجھ سے ہیں اور میں تم سے ہوں تمہارا جسم میرا جسم ہے تمہارا خون میرا خون ہے تمہاری روح میری روح ہے۔

(iv) آیت میں ابنا ئنا کا ذکر پہلے تھا چنانچہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی عمل کی صورت میں ان کو پہلے رکھا پس حضرت حسن علیہ السلام کو انگلی سے اور حضرت حسین علیہ السلام کو گود میں اٹھالیا اور اس کے بعد آیت میں نسـاء نـا کا ذکر تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقامِ عمل میں اپنے پیچھے خاتون جنت کو رکھا اور آیت میں آخر پر انفسـنا کا لفظ تھا لہٰذا مقام عمل میں سب سے پیچھے حضرت علی علیہ السلام تھے اگر چہ اس ترتیب کے عمل میں لانے کا حکم نہیں تھا تاہم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظاہری مفہوم سے واقعی مصداق کی ترتیب کو اپنے عمل سے اس طرح منطبق کر کے دکھایا کہ کبھی کوئی فرد آیت کے مصادیق کی ترتیب میں بھی ٹھوکر نہ کھانے پائے۔

یہ واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی نساء کو ابناء کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا بعید نہیں کہ نساء سے مراد یہاں بیٹیاں ہوں پس اس کی مصداق صرف خاتون جنت ہی ہوگی اور اگر نساء کا عمومی معنی مراد لیا جائے تو عورت کی تین اہم حیثیتوں میں سے خاتون جنت ہر طرح آیت کی مصداق ہیں کیونکہ دعوت مباہلہ میں چار جانے والے مردوں میں سے دو کی ماں ہیں اور ایک کی زوجہ ہیں اور ایک کی دختر ہیں کیونکہ نِسَاءٌ کا لفظ اِمْـرَاَۃٌ کی جمع ہے اور اس کا معنی عورت ہے۔ عورت کے لیے رشتہ کے اہم پہلو صرف یہی تین ہیں کہ زندگی میں قدم رکھتے ہی پہلے پہل بیٹی ہوتی ہے پھر زوجہ بنتی ہے اور پھر ماں بن جاتی ہے۔

(v) خاتونِ جنت کو درمیان میں رکھنے سے مقامِ عمل میں مخدومہ کائنات کے پردہ کی اہمیت کو بھی واضح کرنے کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔ اگر سامنے سے نصاریٰ نظر اٹھا کر ادھر دیکھیں تو ان کے آگے رسالت کی نورانی دیوار حائل ہو جائے اور پیچھے سے مسلمان جاتے ہوئے دیکھیں تو ان کے سامنے امامت کا پردہ آجائے۔ عصمت مآب بی بی

پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔ حتیٰ کہ قدموں کے نشان بھی رسالت وامامت کے نقوش پاک کے درمیان پوشیدہ ہو کر رہ جائیں۔

دعوت مباہلہ:

مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو حکم دیا ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں گفتگو اور جھگڑا کرے تو اسے ''مباہلہ'' کی دعوت دو اور کہو کہ وہ اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کو لے آئے اور تم بھی اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کو بلا لو پھر دعا کرو تا کہ خدا جھوٹوں کو رسوا کر دے۔

''مباہلہ'' کی یہ صورت اس سے پہلے عرب میں رائج نہ تھی اور یہ ایک ایسا راستہ ہے جو سو فیصد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ایمان اور دعوت کی صداقت کا پتہ دیتا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ جو شخص کامل ارتباط (مکمل رابطہ) کے ساتھ خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ وہ ایسے میدان کی طرف آئے اور مخالفین کو دعوت دے کہ آؤ! اکٹھے درگاہِ خدا میں چلیں اس سے درخواست کریں اور دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کر دے اور پھر یہ بھی کہیں کہ تم عنقریب اس کا نتیجہ دیکھ لو گے کہ خدا کس طرح جھوٹوں کو سزا دیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ ایسے میدان کا رخ کرنا بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ اگر دعوت دینے والے کی دعا قبول نہ ہوئی اور مخالفین کو ملنے والی سزا کا اثر واضح نہ ہوا تو نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے ممکن ہے کہ ایک عقلمند اور سمجھدار انسان نتیجے کے متعلق اطمینان کیے بغیر اس مرحلے میں قدم رکھے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے دعوت مباہلہ اپنے نتائج سے قطع نظر، آپ کی دعوت کی صداقت اور ایمانِ قاطع کی دلیل بھی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ ''مباہلہ'' کی دعوت دی گئی تو نجران کے عیسائیوں کے

نمائندے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پاس آئے اور آپؐ سے مہلت چاہی تا کہ اس کے متعلق سوچ بچار کرلیں اور اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کرلیں۔ مشورے کی یہ بات ان کی نفسیاتی حالت ظاہر کرتی ہے۔ بہر حال مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کے درمیان یہ طے پایا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم شور وغل، مجمع اور داد وفریاد کے ساتھ ''مباہلہ'' کے لیے آئیں تو ڈرا نہ جائے اور مباہلہ کرلیا جائے کیونکہ اگر اس طرح آئیں گے تو پھر حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے تو شور وغل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر وہ بہت محدود افراد کے ساتھ آئیں، بہت قریبی خواص اور چھوٹے بچوں کو لے کر وعدہ گاہ میں پہنچیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ وہ خدا کے پیغمبرؐ ہیں اور اس صورت میں ان سے ''مباہلہ'' کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں معاملہ خطرناک ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق عیسائی میدان مباہلہ میں پہنچے تو اچانک دیکھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بیٹے حسینؑ کو گود میں لیے حسنؑ کا ہاتھ پکڑے اور علیؑ و فاطمہؑ کو ہمراہ لیے آ پہنچے ہیں اور انہیں فرمارہے ہیں کہ جب میں دعا کروں تم آمین کہنا۔

عیسائیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انتہائی پریشان ہوئے اور مباہلہ سے رک گئے اور صلح ومصالحت کے لیے تیار ہوگئے اور اہل ذمہ کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ ہوگئے۔

''فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ....'' سے پہلی آیات میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت کی نفی پر استدلال تھا مگر اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر اس علم کے بعد بھی جو تمہارے پاس پہنچا ہے کچھ لوگ تم سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں مباہلہ کی دعوت دو۔ بغیر کہے یہ بات واضح ہے کہ مباہلہ سے مراد یہ نہیں کہ طرفین جمع ہوں۔ ایک دوسرے پر لعنت اور نفرت کا اظہار کریں اور پھر منتشر ہوجائیں کیونکہ یہ عمل تو نتیجہ خیز نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دعا اور نفرت عملی طور پر اپنا اثر ظاہر کرے اور جو

جھوٹا ہوفوراً عذاب میں مبتلا ہو جائے۔آیت میں مباہلہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطق واستدلال کے غیر موثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لیے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دعا نہ تھی بلکہ اس کا خارجی اثر پیش نظر تھا۔

عظمت اہل بیتؑ کی ایک زندہ سند:

شیعہ اور سنی مفسرین اور محدثین نے وضاحت کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیت رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن افراد کو اپنے ہمراہ وعدہ گاہ کی طرف لے گئے تھے وہ صرف ان کے بیٹے (نواسے) حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام، ان کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام تھے۔اس بناء پر آیت میں "ابنآئنا" سے مراد صرف امام حسن اور امام حسین علیہما السلام ہیں۔"نسآئنا" سے مراد جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں اور "انفسنا" سے مراد صرف حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔اہل سنت کے بعض مفسرین نے جو بہت کم تعداد میں ہیں۔اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً مؤلف "المنار" نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے "یہ تمام روایات شیعہ طرق سے مروی ہیں۔ان کا مقصد معین ہے۔انہوں نے ان احادیث کی نشر واشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے۔جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی غلطی لگی ہے۔"

لیکن اہل سنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ نشاندہی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طرق کا شیعوں یا ان کی کتابوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں اور اگر اہل سنت کے طرق سے مروی ان احادیث کا انکار کیا جائے تو ان کی باقی احادیث اور کتب بھی درجہ اعتبار سے گر جائیں گی۔اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لئے اہل سنت کے طرق سے کچھ روایات ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب ''احقاق الحق'' کی جلد سوم طبع جدید صفحہ 46 پر لکھتے ہیں: ''مفسرین اس مسئلے میں متفق ہیں کہ ' ابنائنا '' سے اس آیت میں حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام مراد ہیں۔ ''نسائنا '' سے حضرت فاطمہؑ مراد ہیں۔اور ''انفسنا'' میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے''

اس کے بعد کتاب مذکورہ کے حاشیے پر تقریباً ساٹھ بزرگان اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنھوں نے تصریح کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیت رسول علیھم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان کے نام اوران کی کتب کی خصوصیات صفحہ 46 سے لے کر صفحہ 76 تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان شخصیتوں میں سے یہ زیادہ مشہور ہیں:

1. مسلم بن حجاج نیشاپوری، مؤلف صحیح مسلم جو نامور شخصیت ہیں اوران کی حدیث کی کتاب اہل سنت کی چھ قابل اعتماد صحاح میں سے ہے ملاحظہ ہو مسلم جلد 7 صفحہ 120
2. احمد بن حنبل نے اپنی ''مسند'' میں لکھا ہے ملاحظہ ہو جلد 1 صفحہ 185 مطبع مصر۔
3. تفسیر طبری جلد 3 صفحہ 192 میں اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے۔
4. حاکم نے اپنی ''مستدرک'' میں لکھا ہے دیکھیے جلد 3 صفحہ 15 مطبوعہ حیدر آباد دکن
5. حافظ ابو نعیم اصفہانی کتاب ''دلائل النبوۃ'' صفحہ 297 مطبوعہ حیدر آباد دکن۔
6. واحدی نیشاپوری'' کتاب ''اسباب النزول'' صفحہ 74 طبع ہندیہ۔
7. فخر رازی نے اپنی مشہور تفسیر کبیر میں لکھا ہے دیکھیے جلد 8 صفحہ 85 طبع مصر۔
8. ابن اثیر ''جامع الاصول'' جلد 9 صفحہ 480 طبع مصر۔
9. ابن جوزی ''تذکرۃ الخواص'' صفحہ 17 طبع نجف۔
10. قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر جلد 2 صفحہ 22 طبع مصطفےٰ محمد مصر۔
11. آلوسی نے تفسیر ''روح المعانی'' جلد سوم صفحہ 167 طبع منیریہ مصر۔
12. معروف مفسر طنطاوی نے اپنی تفسیر ''الجواھر'' میں لکھا ہے۔جلد 2 صفحہ 120

13. زمخشری نے تفسیر ''کشاف'' جلد 1 صفحہ 193 مطبوعہ مصطفیٰ محمد مصر۔

14. حافظ احمد ابن حجر عسقلانی ''الاصابۃ'' جلد 2 صفحہ 503 مطبوعہ مصطفیٰ محمد مصر

15. ابن صباغ، ''فصول المھمۃ'' صفحہ 108 مطبوعہ نجف۔

16. علامہ قرطبی ''الجامع لاحکام القران'' جلد 3 صفحہ 104 مطبوعہ مصر 1936

''غایۃ المرام'' میں ''صحیح مسلم'' کے حوالے سے لکھا ہے: ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے کہا: تم ابوتراب (علیؑ) کو سب وشتم کیوں نہیں کرتے۔ وہ کہنے لگا۔ جب سے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آئی ہیں میں نے اس کام سے صرف نظر کرلیا ہے۔ ان میں ایک یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے صرف حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیھا، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت امام علی علیہ السلام کو دعوت دی۔ اس کے بعد فرمایا: " اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھلِیُ " خدایا ! یہ میرے نزدیکی اور خواص ہیں۔

تفسیر ''کشاف'' کے مؤلف اہل سنت کے بزرگوں میں سے ہیں۔ وہ اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں ''یہ آیت اہل کساءؑ کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے قوی ترین دلیل ہے۔''

شیعہ مفسرین، محدثین اور مورخین بھی سب کے سب اس آیت کے ''اہل بیتؑ'' کی شان میں نازل ہونے پر متفق ہیں چنانچہ ''نور الثقلین'' میں اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی گئیں ہیں۔

''عیون الاخبار الرضا'' میں ایک مجلس مناظرہ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جو مامون نے اپنے دربار میں منعقد کی تھی۔ اس میں ہے کہ حضرت امام علی ابن موسی رضا علیھما السلام نے فرمایا: خدا نے اپنے پاک بندوں کی آیت مباہلہ میں پہچان کروادی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو حکم دیا ہے۔ اس آیت ''فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ کَ مِنَ

الْعِلْمِ.... " کے نزول کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت امام علی علیہ السلام کو اپنے ساتھ مباہلہ کے لئے لے گئے اور یہ ایسی خصوصیت اور اعزاز ہے کہ جس میں کوئی شخص اہل بیتؑ پر سبقت حاصل نہیں کر سکا اور یہ ایسی منزلت ہے جہاں تک کوئی شخص بھی نہیں پہنچ سکا۔ ایسا شرف ہے جو اس سے پہلے کوئی حاصل نہیں کر سکا۔[1]

"تفسیر برہان"، "بحار الانوار" اور تفسیر عیاشی میں بھی اس مضمون کی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو تمام اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ مندرجہ بالا آیت "اہل بیتؑ" کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اس مقام پر ایک مشہور اعتراض کیا جاتا ہے۔ یہ اعتراض فخر الدین رازی اور بعض دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ "ابنائنا" (ہمارے بیٹے) سے مراد "حسنؑ وحسینؑ" ہوں جب کہ "ابنائنا" جمع ہے اور (عربی میں) جمع کا لفظ دو کے لئے نہیں ہوتا۔ اسی طرح کیسے ممکن ہے نسائنا (ہماری عورتیں) جو جمع کا لفظ ہے صرف شہزادی اسلام حضرت فاطمہؑ کے لئے ہو اور یوں ہی "انفسنا" سے صرف حضرت علیؑ مراد ہوں۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں آیا ہے؟

اس کے جواب میں پہلی بات کہ بہت سی احادیث، بہت سی مشہور منابع اور معتبر اسلامی کتب میں جن میں شیعہ سنی سب شامل ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت "اہل بیتؑ" کے حق میں نازل ہوئی ہے اور ان میں تصریح کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم

[1] نور الثقلین جلد 1 صفحہ 349، تفسیر برہان جلد 1 صفحہ 290، تفسیر عیاشی جلد 1 صفحہ 177، بحار الانوار طبع جدید جلد 20 صفحہ 52، جلد 6 صفحہ 652

سوائے حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کے کسی کو مباہلہ کے لئے نہیں لے گئے۔ یہ بات آیت کی تفسیر کے لئے خود ایک واضح قرینہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ منجملہ ان قرائن کے جو آیات قرآن کی تفسیر کرتے ہیں ایک سنت اور قطعی شان نزول بھی ہے۔ اس بنا پر مذکورہ اعتراض کے جواب کی ذمہ داری فقط شیعوں پر نہیں بلکہ تمام علماء اسلام کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جمع کے صیغے کا مفرد یا تثنیہ پر اطلاق کوئی نئی بات نہیں۔ آیات قرآن میں ایسے متعدد مواقع ہیں جہاں عبارت میں جمع کا صیغہ آیا ہے لیکن اس کا مصداق کسی جہت سے ایک ہی فرد ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران آیت 173 میں ہے:

" اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ [1] "

مفسرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ یہاں ' الناس " سے مراد نعیم بن مسعود ہے جس نے ابوسفیان سے مال لے رکھا تھا تاکہ مسلمانوں کو مشرکین کی طاقت سے ڈرایا جائے۔

مفسرین کی ایک جماعت کی تصریح کے مطابق سورۃ آل عمران آیت 181 "لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیۡرٌ وَّنَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ [2] " میں "الذین " سے مراد "حی بن اخطب" یا "فنحاص " ہے۔

کبھی مفرد کے لئے جمع کا صیغہ اس کی بزرگی کے اظہار کے لئے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہے: "اِنَّ اِبۡرٰهِیۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ " ابراہیم بارگاہ الٰہی میں خضوع کرنے والی امت تھے۔ (النحل 16 آیہ 120)

[1] وہ افراد کہ جنہیں لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے (تم پر حملے کے لئے) اکٹھ کرلیا ہے ان سے ڈرو۔

[2] خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے تھے خدا فقیر ہے اور ہم تونگر و بے نیاز ہیں اسی لئے اس نے ہم سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔

بیٹی کی اولاد:

آیہ مباہلہ سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو بھی "ابن" (بیٹا) کہا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اس کے برعکس مرسوم تھا کہ صرف بیٹے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا جاتا اور کہا جاتا تھا:

بَنُوْنَا بَنُوْ اَبْنَائِنَا وَ بَنَاتُنَا بَنُوْهُنَّ اَبْنَآ ءُ الرِّجَالِ الْاَ بَاعِدِ ۱؎

بیٹوں اور عورتوں کو انسانی معاشرے کا حقیقی حصہ نہ سمجھنے کی طرز فکر بھی اسی غلط سنت جاہلیت کی پیداوار تھی۔ وہ عورتوں کو اپنی اولاد کی نگہداری کے لئے فقط ظرف سمجھتے تھے جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے:

وَاِنَّمَا اُمَّهَاتُ النَّاسِ اَوْعِيَةٌ مُسْتَوْدَعَاتٌ وَلِلْاَ نُسَابِ اٰبَآءٌ ۲؎

اسلام نے اس طرز فکر کی شدید نفی کی اور اولاد کے احکام پوتوں اور نواسوں پر ایک ہی طرح سے جاری کیے۔ سورہ انعام آیہ 84 اور 85 میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے بارے میں ہے۔ "وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ٥وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۳؎"

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ

۱؎ ہماری اولاد تو فقط ہمارے پوتے ہیں۔ رہے ہمارے نواسے تو وہ دوسروں کی اولاد ہیں نہ کہ ہماری۔ ۲؎ لوگوں کی مائیں ان کی پرورش کے لئے ظروف کی حیثیت رکھتی ہیں اور نسب کے لئے تو صرف باپ ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ۳؎ اور اولاد ابراہیمؑ میں سے داوٗدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰ اور ہارونؑ تھے اور اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں نیز زکریاؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰؑ (بھی تھے) جو سب کے سب صالحین میں سے تھے۔

وہ بیٹی کی اولاد تھے اور جو شیعہ سنی روایات حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام کے بارے میں مذکور ہیں ان میں بارہا "اِبْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ" (فرزند رسولؐ) کا لفظ ان کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

وہ آیات جن میں ایسی عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے ان کے لیے فرمایا گیا ہے: "وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ" یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں (سورۃ النساء آیت 23)

فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مسلم ہے کہ بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں انسان پر حرام ہیں اور وہ سب مندرجہ بالا آیت میں داخل ہیں۔

عیون الاخبار سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ کاظمؑ سے ہارون نے دریافت کیا تھا کہ تم کیسے ذریت پیغمبرؐ کہلاتے ہو۔ حالانکہ ہمارے پیغمبرؐ کی نسل نہیں ہے کیونکہ نسل بیٹوں سے ہوا کرتی ہے نہ کہ بیٹیوں سے اور تم بیٹی کی اولاد ہو۔

آپؑ نے فرمایا کہ میں تجھے قرابت اور قبر رسولؐ اور صاحب قبر کا واسطہ دے کر اس سوال کے جواب سے معافی چاہتا ہوں۔ ہارون نے جواب دیا کہ مجھے جہاں تک خبر پہنچی ہے آپ اولاد علیؑ میں سردار اور ان کے امام وقت ہیں۔ لہٰذا میرے ساتھ اس مسئلہ میں دلیل و برہان سے بات فرمایئے اور میں جو کچھ آپ سے دریافت کر رہا ہوں اس کی ہرگز معافی نہ دوں گا۔ جب تک آپ قرآن مجید سے اپنے دعویٰ کا ثبوت نہ دیں اور اے اولاد علیؑ تمہارا تو یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا کوئی حرف نہیں جس کی تاویل تمہارے پاس نہ ہو اور تم اس کی حجت میں پیش کرتے ہو۔ " مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ [1]" اور دیگر تمام علماء کے قیاسات اور خیالات سے تم بے نیازی ظاہر کرتے ہو۔

آپؑ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: اچھا مجھے اجازت دیجئے تا کہ میں کچھ کہوں

[1] ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی یعنی قرآن میں ہر چیز بیان کردی ہے (سورۃ الانعام 6 آیۃ 38)

ہارون نے کہا اجازت ہے بیان کیجئے فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیت کی تلاوت کی:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمِنْ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ٥وَ زَکَرِیَّا وَ یَحْیٰ وَ عِیْسٰی وَاِلْیَاسَ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ٥

پس میں نے دریافت کیا بتایئے حضرت عیسیٰؑ کے باپ کون تھے ہارون نے جواب دیا کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ نہ تھا۔ پس میں نے کہا کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو ماں کی وجہ سے ذریت انبیاءؑ میں داخل فرمایا اور اسی طرح ہمیں بھی ماں کے ذریعے سے ذریت پیغمبرؐ قرار دیا۔

پھر میں نے کہا کچھ اور بھی کہوں۔ اس نے کہا کہ ہاں پس میں نے آیت مباہلہ کی تلاوت کی اور کہا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاریٰ کے مباہلہ کے دن حضرت علی ابن ابی طالبؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ کے علاوہ کسی اور کو بھی دعوت دی ہو اور آیت میں ابنـــاء نـا سے مراد حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ ہیں اور نساء نا سے مراد جناب فاطمہؑ ہیں اور انفسنا سے مراد جناب علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے مامون نے بھی اسی طرح کے سوالات کئے تھے۔ ان سوالات کے ایک یہ بھی تھا کہ مامون نے دریافت کیا کہ آپؑ کے جد پاک حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی خلافت پر دلیل کیا ہے؟

تو آپؑ نے فرمایا کہ آیت " انفسنا" مامون نے کہا ٹھیک ہے بشرطیکہ نسائنا کا لفظ نہ ہو۔ آپؑ نے فرمایا ہاں اگر ابناء نا نہ ہو۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَـا الـدَّ لِیْـلُ عَلٰی خِلَافَۃِ جَدِّکَ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ؟ قَالَ اٰیَۃُ اَنْفُسَنَا قَالَ لَوْلَا نِسَاءُ نَا قَالَ لَوْلَا اَبْنَاءُ نَا.

اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ جب مامون نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کی

دلیل طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ انفسنا کی آیت یعنی آیت مباہلہ کیونکہ اس آیت میں حضرت علی علیہ السلام کو نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا گیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کا نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا استحقاقِ خلافت کے لیے کافی ہے۔

جن پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو افضیلت حاصل ہے ان پر نفس رسولؐ کو بھی افضلیت حاصل ہوگی اور شئی اور نفس شئی کا حکم ایک ہی ہوا کرتا ہے۔

اس پر مامون نے اعتراض کیا لو لا نساء نا یعنی انفسنا سے حضرت علی علیہ السلام کا نفس رسولؐ ہونا ثابت نہیں کیونکہ یہاں انفس سے مراد مطلق مرد ہیں اور حضرت علی علیہ السلام ان میں ایک فرد ہے اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں خدا نے نسائنا کو ذکر فرمایا ہے اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انفس سے مراد مرد ہیں۔ ہاں اگر نساء نا کا لفظ نہ ہوتا تو حضرت علی علیہ السلام کا نفس رسولؐ ہونا اس آیت سے سمجھا جا سکتا تھا۔ آپؑ نے اس کی تردید میں فرمایا "لو لا ابناء نا" یعنی اگر نساء نا کے قرینہ سے انفسنا کا معنی مطلق مرد ہو تو ابناء نا کیوں ذکر کیا گیا یہ بھی تو مردوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ نساء نا کے مقابلے میں اگر ابناء نا کا ذکر نہ ہوتا تو نساء نا سے مراد عورتیں اور ان کے مقابلہ میں انفس سے مراد مرد لیے جا سکتے تھے لیکن جب ان کا مقابلہ ابناء نا سے ہو تو اصطلاحِ قرآن کے مطابق نساء سے مراد لڑکیاں ہو جایا کرتیں ہیں لہٰذا انفسٌ اپنے معنی حقیقی پر رہتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کے خلیفہ بلا فصل ہونے پر واضح نص ہے۔

اہل سنت کی تفسیر ثعلبی سے منقول ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب قوم نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تو نصاریٰ نے کہا کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے جب علیحدہ مجلس مشاورت قائم ہوئی تو انہوں نے مل جل کر عاقب سے کہا جو ان کا صاحب رائے تھا عبدالمسیح (یہ اس کا لقب ہے) تیرا کیا مشورہ ہے؟ اس نے جواب دیا اے

نصرانیوں خدا کی قسم تمہیں معلوم تو ہے ہی کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی مرسل ہیں اورانہیں اللہ کی جانب سے بھیجا ہوا ہے اور خدا کی قسم کبھی کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ کی جرأت نہیں کی مگر یہ کہ اس کا پوری طرح ستیاناس ہوگیا۔ان کے چھوٹے بڑے سب فنا ہوگئے اگرتم ایسا کروگے تو یقیناً ہم سب تباہ ہوجائیں گے۔ہاں اگرتم اپنے مذہب کے خیر خواہ ہواوراسی دین پر رہنے کے متمنی ہوتو چپ چاپ واپس جانے میں ہی اپنی خیر سمجھو۔

پس جب صبح ہوئی تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسین علیہ السلام کو گود میں لیا اور حضرت حسن علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ان کے پیچھے روانہ ہوئیں اور حضرت علی علیہ السلام جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے پیچھے تھے اور آپؐ ان کو فرما رہے تھے کہ دیکھنا جب میں دعا مانگوں تم سب آمین کہنا۔نجران کے اسقف (پادری) نے نصاریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں اگر وہ اللہ سے سوال کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ہٹ جائے گا۔پس ان لوگوں سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔قیامت تک زمین پر کوئی نصرانی باقی نہیں رہے گا۔

پس انہوں نے یہ بات مانتے ہوئے بارگاہ رسالت میں عرض کی کہ ہماری رائے یہ ہے کہ ہم مباہلہ چھوڑ دیں۔آپ اپنے دین پر رہیں اور ہم اپنے دین پر رہیں۔آپؐ نے فرمایا اگرتم مباہلہ سے انکار کرتے ہوتو پھر تمہیں اسلام قبول کرنا چاہیے۔پس مسلمانوں کے ساتھ تم نفع ونقصان میں شریک ہوجاؤ گے تو انہوں نے اس بات سے انکار کیا۔آپؐ نے فرمایا پھر جہاد کی دعوت دیتا ہوں ۔انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپؐ کے ساتھ لڑنے کی جرأت نہیں کرتے۔البتہ ہم آپؐ سے مصالحت کے خواہشمند ہیں جس کی شرائط یہ ہوں گی:

(i) آپ ہمیں نہ چھیڑیں گے۔

(ii) ہمیں خوفزدہ بھی نہ کیا جائے گا بلکہ پرامن زندگی گزارنے کی سہولت دی

جائے گی۔

(iii) ہمیں اپنا دین چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

(iv) ہم ہر سال 2 ہزار لباس ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار رجب میں اور تیس زرہ لوہے کی ادا کرتے رہیں گے۔

پس آپؐ نے منظور فرمالیا اور فرمایا کہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ تحقیق موت اہل نجران پر اپنے پر کھول چکی تھی اور اگر وہ مباہلہ کرتے تو بندر اور سور کی شکل میں مسخ ہو جاتے اور پوری وادی ان کے لئے آگ سے بھڑک اٹھتی اور خدا نجران اور اہل نجران کو تباہ کر دیتا یہاں تک کہ درختوں پر پرندے بھی زندہ نہ رہ سکتے اور ایک سال کے اندر اندر تمام روئے زمین کے نصرانی لقمہ اجل ہو جاتے۔

کیا مباہلہ ایک عمومی حکم ہے؟

اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کو مباہلہ کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ گفتگو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے ہے تاہم یہ بات مخالفین کے مقابلے میں مباہلہ کے عمومی حکم سے مانع نہیں یعنی جب دلائل پیش کرنے کے باوجود دشمن اصرار کریں اور ہٹ دھرمی کا ثبوت دیں تو کامل تقویٰ اور خدا پرستی کے حامل اہل ایمان انہیں مباہلے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

اسلامی منابع میں اس ضمن میں مذکورہ روایات سے بھی اس حکم کی عمومیت ثابت ہوتی ہے۔ تفسیر نور الثقلین جلد 1 صفحہ 351 میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا: مخالفین تمہاری حق کی باتیں قبول نہ کریں تو انہیں دعوتِ مباہلہ دو۔ راوی کہتا ہے: میں نے کہا کہ کیسے مباہلہ کریں؟ فرمایا: تین دن تک اپنی اخلاقی اصلاح کرو۔ راوی مزید کہتا ہے: ”میرا گمان ہے کہ آپؐ نے فرمایا روزہ رکھو اور غسل کرو جس

سے مباہلہ کرنا چاہتے ہو اسے صحرا میں لے جاؤ۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالو اور اپنی طرف سے ابتدا کرو اور کہو خداوندا تو سات آسمانوں اور سات زمینوں کا پروردگار ہے اور پوشیدہ اسرار سے آگاہ ہے رحمٰن ورحیم ہے میرے مخالف نے اگر حق کا انکار کیا ہے اور باطل کا دعویٰ کیا ہے تو آسمان سے اس پر بلا ومصیبت نازل فرما اور اسے دردناک عذاب میں مبتلا کردے: اس دعا کو دہراؤ اور کہو: یہ شخص اگر حق کا انکار کرتا ہے اور باطل کا دعویٰ دار ہے تو آسمان سے اس پر بلا نازل کردے اور اسے عذاب میں مبتلا کردے۔" اس کے بعد آپؑ نے فرمایا: زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ اس دعا کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ خدا کی قسم میں نے ہرگز ایسا کوئی شخص نہیں پایا جو تیار ہو کہ اسی طرح اس کے ساتھ مباہلہ کیا جائے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے ان لوگوں کو بھی جواب مل جاتا ہے جو بے سمجھے سوچے اسلام کو مَردوں کا دین قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں عورتیں کسی شمار میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ خاص مواقع پر اسلامی مقاصد کی پیش رفت کے لئے عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ دشمن کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیھا، ان کی دختر نیک اختر جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیھا اور ایسی خواتین جو ان کے نقش قدم پر چلیں ان کی زندگی کے درخشاں صفحات اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

خلاصہ

☆ مباہلہ دراصل بھل کے مادہ سے ہے یہ لفظ کبھی کبھار ہلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کے معنی میں آتا ہے۔ مذکورہ آیت میں دو اشخاص کے ایک دوسرے پر نفرت کا اظہار کرنے کو کہتے ہیں۔

☆ فَقُلْ تَعَالَوْا: حق کے اثبات کے دو طریقے تھے۔ دلیل و برہان اور استجابت دعا

چند غور طلب باتیں:

(i) نصاریٰ کی طرف سے جو زن و مرد مباہلہ میں شرکت کرتے وہ صرف وہی ہو سکتے تھے جو دل و جان سے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت (معبود ہونے) کے مدعی تھے۔ دوسری طرف سے جو زن و مرد نصاریٰ کے مقابلے میں جائیں وہ وہی ہونے چاہییں جن کو حضرت عیسیٰؑ کے عبد اور مخلوق خدا ہونے کا یقینِ کامل ہو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دعویٰ مذکورہ میں شریک اور دعوت اسلام میں بھی ان کے ساتھ حصہ دار ہوں۔

(ii) آیت کے اختتام میں جمع کا صیغہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ جانے والے کاذبین نہ تھے بلکہ صادقین تھے۔

(iii) اس دعوت اسلام میں ان افراد کو شریک کیا جائے گا جو حضورؐ سے بمنزلہ نفس ہوں جس طرح جسم سے نفس (روح) کی نسبت ہوا کرتی ہے۔ جمع کے صیغے سے خطاب کے باوجود صرف حضرت علیؑ کا انتخاب اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی بھی

اس مرتبے پر فائز نہ تھا۔ پس یہی آیت حضرت علیؑ کی جملہ صحابہؓ بلکہ تمام انبیاءؑ سے افضل ہونے کی نص صریحہ ہے۔ کیونکہ نفس اور شے کا حکم ایک ہوا کرتا ہے۔

(iv) جب نساء کو ابناء کے مقابلہ میں استعمال کیا جائے تو اس سے مراد بیٹیاں ہوتا ہے۔

(v) آیت میں ابنائنا، نسائنا اور انفسنا کی ترتیب کو میدان عمل میں ملحوظ خاطر رکھ کر آپؐ نے ظاہری مفہوم سے واقعی مصداق کی ترتیب کو اپنے عمل سے اس طرح قائم کر کے دکھایا کہ کبھی کوئی فرد آیت کے مصادیق کی ترتیب میں بھی ٹھوکر نہ کھانے پائے۔

(vi) خاتون جنت کو درمیان میں رکھنے سے پردہ کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے سامنے رسالت کی نورانی دیوار پیچھے امامت کا پردہ۔ تا کہ معصومہ بی بیؑ پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے حتیٰ کہ قدموں کے نشان بھی رسالت و امامت کے نقوش پاک کے درمیان پوشیدہ ہو کر رہ جائیں۔

☆ آیت میں مباہلہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطق و استدلال کے غیر موثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لیے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دعا نہ تھی بلکہ اس کا خارجی اثر پیش نظر تھا۔

☆ آیت مباہلہ عظمت اہل بیتؑ کی ایک زندہ سند ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب احقاق الحق میں لکھتے ہیں کہ مفسرین اس مسئلے میں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت اہل بیتؑ کے بارے میں نازل ہوئی اور انہوں نے حاشیے پر تقریباً 60 بزرگان اہل سنت کی لسٹ بھی دی ہے جنہوں نے وضاحت کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی۔

☆ غایۃ المرام میں ''صحیح مسلم'' کے حوالے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت علیؑ بھی حضورؐ کے اہل میں سے ہیں: ''اللھم ھولاء اھلی''

☆ ہارون کا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور مامون کا حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے مکالمہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل ان کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا سے چلی اسی لیے اہل بیتؑ اولادِ رسولؐ ہیں۔

☆ حضرت علیؑ کے نفسِ رسولؐ ہونے سے آپؑ کی خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے۔

☆ علامہ فخر الدین رازی اور بعض دوسرے لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ آیت میں **ابنائنا، نسائنا انفسنا** جمع کے صیغے ہیں ان سے حضرت علیؑ حضرت فاطمۃ الزہراءؑ اور حسنینؑ شریفین کو مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں:

(i) شیعہ اور سنی معتبر کتابوں میں نساء سے حضرت فاطمہؑ، انفسؑ سے حضرت علیؑ، ابناء سے حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ مراد لیے گئے۔ کیا یہ محدثین اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ جمع کے صیغے ہیں کہ اس کا مصداق واحد یا تثنیہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال آیت میں جمع کے صیغے استعمال کر کے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آیت میں گنجائش تھی۔ لیکن اگر اس کا مصداق دو بچوں ایک خاتون اور ایک مرد کے سوا کوئی اور ہوتا تو آپ اسے بھی ضرور لے جاتے۔

(ii) آیات قرآن میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں عبارت میں جمع کا صیغہ آیا ہے۔ لیکن اس کا مصداق ایک مرد ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران آیت 173 میں **الناس** سے مراد ایک ہی شخص نعیم بن مسعود اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 181 میں **الذین** سے مراد حی بن اخطب یا فنحاص ہے۔ کبھی کبھار مفرد کے لیے جمع کا صیغہ اس کی بزرگی کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

خود آزمائی

1. مباہلہ کا معنی اور مفہوم بیان کریں؟

2. حق کے اثبات کے کتنے طریقے ہیں؟

3. مباہلہ میں طرفین میں سے ایک ایک آدمی کافی تھا لہٰذا بیٹوں، بیٹیوں اور نفوس کو دعائے ہلاکت میں کیوں شریک کیا گیا؟

4. آیت مباہلہ میں کاذبین کا لفظ موجود ہے اس سے مباہلہ میں فتح پانے والوں کو آپ صادقین کیسے ثابت کریں گے؟

5. کیا رسولؐ خدا اپنے ساتھ جن ہستیوں کو میدان مباہلہ میں لے کر گئے تھے ان کے جانے کی ترتیب آیت کے مطابق تھی بیان کریں؟

6. حضرت فاطمہ علیہا السلام کو درمیان میں رکھنے سے کیا اشارہ ملتا ہے؟

7. نجران کے عیسائیوں سے اسلامی روایات کی روشنی میں مباہلہ کی تفصیل بیان کریں؟

8. کیا آیت مباہلہ عظمت اہل بیتؑ کی ایک زندہ سند ہے اہل سنت کی معتبر کتب کا حوالہ بھی دیں؟

9. ابناء، نساء اور انفس جمع کے صیغے ہیں اس سے حضرت علیؑ ، حضرت فاطمۃ الزہراؑ، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کیسے مراد لیے جاسکتے ہیں؟

10. "نساء" سے مراد عورتیں ہے مگر اس لفظ کو بیٹیوں کے معنی میں کب لیا جاتا ہے؟

11. آپ کیسے ثابت کریں گے کہ حضرت علی علیہ السلام کے نفسِ رسولؐ ہونے سے آپ کی خلافت بلافصل مراد ہے؟

12. حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ہارون رشید سے کیا مکالمہ ہوا بیان کریں؟

13. حضرت امام علی رضا علیہ السلام اور مامون رشید کے مکالمے کی تفصیلات بیان کریں؟

3

آیت مودّت

ذٰلِکَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ○

(سورۃ الشوریٰ 42 آیت 23 پارہ 25)

ترجمہ: یہی وہ (انعام) ہے جس کی خدا اپنے ان بندوں کو خوشخبری دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجیے۔ میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابت داروں (اہل بیتؑ) کی محبت کے سواتم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا اور جو شخص نیکی حاصل کرے گا۔ ہم اس کے لیے اس کی خوبی میں اضافہ کردیں گے۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا قدردان ہے۔

تفسیر

شانِ نزول:

تفسیر مجمع البیان میں اس سورۃ کی 23 تا 26 آیت کی شان نزول پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مروی ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لا چکے اور اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں تو انصار نے کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر عرض کرتے ہیں کہ اگر آپؐ کو مالی مشکلات درپیش ہیں تو ہمارے یہ مال غیر مشروط طور پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی باتیں سن لیں تو یہ آیت نازل ہوئی قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت انہیں سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد بھی میرے قریبیوں سے محبت کرنا۔ یہ سن کر وہ خوشی خوشی وہاں سے واپس آ گئے۔

لیکن منافقین نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ یہ بات (معاذ اللہ) رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے از خود کہی ہے اور خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے بعد ہمیں اپنے رشتہ داروں کے آگے ذلیل و رسوا کرے۔ چنانچہ اس کے بعد اگلی آیت نازل ہوئی "اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ... کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (رسولؐ) نے خدا پر جھوٹ

بہتان باندھا ہے" جوان لوگوں کا جواب تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو بھیج کر یہ آیت انہیں سنائی۔ کچھ لوگ نادم ہو کر رونے لگے اور سخت پریشان ہوئے۔ آخر کار اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے۔ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ.. اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے آنحضرتؐ نے پھر کسی کو بھیج کر یہ آیت ان تک پہنچائی اور انہیں خوشخبری دی کہ ان کی خالص توبہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہو چکی ہے۔[1]

تفسیر صافی میں بروایت کافی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جب حضورؐ حجۃ الوداع سے واپس مدینہ میں پہنچے تو انصار نے جمع ہو کر حضورؐ کو ان کی تبلیغی خدمات کے صلے میں کچھ مال پیش کرنے کی پیش کش کی۔ ان کے کافی اصرار کے بعد آپؐ نے بحکم پروردگار یہ آیت تلاوت کی تو فوراً منافقین میں چہ مے گوئیاں شروع ہو گئیں کہ یہ سب اپنے چچازاد کی برتری جتلانے اور اپنے خاندان کو ہماری گردنوں پر سوار کرنے کا ہی بہانہ ہے۔ چنانچہ کل کی بات ہے کہ حج سے واپسی پر "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ"[2] کا اعلان کیا تھا اب مودت فی القربیٰ کو اجر رسالت کے طور پر طلب کر رہے ہیں۔

مودّتِ اہل بیتؑ اجر رسالتؐ ہے:

دین کا تعین پروردگارِ عالم کی طرف سے اور تبلیغ کا کام اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ہوتا ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ رسالت کی وجہ سے یہ خیال لوگوں کے دل میں آسکتا تھا کہ آپؐ اپنی رسالت کی تبلیغ کا لوگوں سے اجر طلب فرمائیں گے۔ اسی بارے میں فوراً پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ "کہہ دے! میں اس بارے میں تم سے کچھ نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے قریبیوں کے ساتھ محبت کرو۔"

[1] مجمع البیان جلد 9 صفحہ 29　[2] جس جس کا میں مولا ہوں پس اس اس کا علیؑ مولا ہے۔

ذوی القربیٰ کی دوستی جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا ولایت کے مسئلے اور خاندان رسالت میں سے ہونے والے آئمہ معصومین علیہم السلام کی پیشوائی اور رہبری کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ جو درحقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہبری اور ولایت الٰہیہ کے تسلسل کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ اس ولایت اور رہبری کو تسلیم کرنا ایسا ہے جیسا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت ونبوت کو تسلیم کرنا جو انسان کی اپنی سعادت کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ خود انسان کی طرف ہی لوٹ جاتا ہے۔

مودّت فی القربیٰ کی وضاحت:

اس جملہ کے بارے میں مفسرین نے لمبی چوڑی گفتگو اور خوب بحث کی ہے اور جب ہم خالی الذہن ہوکر ان کے پہلے سے طے شدہ فیصلے کے تحت بیان کردہ تفاسیر کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف عوامل اور اسباب کی وجہ سے آیت کے اصلی مفہوم سے ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے ایسے احتمالات کو اپنایا ہے جو نہ تو آیت کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں نہ شان نزول سے اور نہ ہی دوسرے تاریخی اور روایاتی قرائن سے

اس سلسلے میں تقریباً چار مشہور تفسیریں بیان ہوئی ہیں:

1. ذوی القربیٰ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام ہیں اور ان کی محبت آئمہ معصومین علیہم السلام کی امامت و رہبری کو تسلیم کرنے کا ایک ذریعہ اور فریضے کی ادائیگی کی ضمانت ہے۔

اس معنی کو بہت سے قدیمی اہل سنت مفسرین اور تمام شیعہ مفسرین نے اپنایا ہے۔ شیعہ وسنی دونوں کی طرف سے اس بارے میں بہت سی روایات منقول ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

2. دوسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ رسالت کا اجر یہی ہے کہ تم ان چیزوں کو دوست رکھو جو تمہیں ''خدا کے قرب'' کی دعوت دیتی ہیں۔

اس تفسیر کو بعض اہل سنت مفسرین نے اپنایا ہے جو کسی بھی لحاظ سے آیت کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم خدا کی اطاعت کو دوست رکھو اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دو۔ جبکہ کہنا یہ چاہیے تھا کہ میں تم سے خدا کی اطاعت کو چاہتا ہوں (نہ کہ اطاعت الٰہی کی محبت)

اس کے علاوہ آیت کے مخاطب افراد میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خدا کا قرب نہ چاہتا ہو حتیٰ کہ مشرکین بھی اس بات کے خواہش مند تھے کہ خدا کے نزدیک ہوں اور اصولی طور پر وہ بتوں کی پرستش کو اسی بات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

3. تیسری تفسیر کے مطابق تم اجر رسالت کے طور پر اپنے قریبی رشتہ داروں کو دوست رکھو اور صلہ رحمی بجالاؤ۔

اس تفسیر میں رسالت اور اجر رسالت کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی کیونکہ اپنے رشتہ داروں سے دوستی کرنے سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کون سی خدمت ہوسکتی ہے۔ پھر یہ دوستی کس طرح اجر رسالت قرار پاسکتی ہے۔

4. چوتھی تفسیر سے مراد یہ ہے کہ تم سے جو میری قرابت ہے اس کی حفاظت کرو اور اسے محفوظ رکھو۔ یہی میری رسالت کا اجر ہے۔ چونکہ میرا تمہارے اکثر قبائل سے رشتہ ہے لہٰذا مجھے تکلیف نہ پہنچایا کرو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسبی لحاظ سے قریش کے قبائل سے رشتہ تھا اور سببی (ازدواجی) لحاظ سے بہت سے قبائل سے تعلق تھا۔ نیز مادری لحاظ سے مدینہ میں قبیلہ بنی نجار کے متعدد لوگوں سے تھا۔

یہ تعبیر تمام معنوں میں سے بدترین معنیٰ ہے جو آیت کے لئے کیا جاتا ہے کیونکہ

اجر رسالت کا تقاضا ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو قبول کر چکے ہیں۔ جب یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو قبول کر چکے ہیں تو پھر ان سے اس قسم کی خواہش کا اظہار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احترام کیا کرتے تھے پھر کیا ضرورت تھی کہ وہ آپؐ کا بحیثیت نسبی یا سببی رشتہ دار کے احترام کریں کیونکہ رسالت کی وجہ سے کیا جانے والا احترام دوسرے تمام اسباب و وجوہات سے بالاتر ہوتا ہے۔ درحقیقت اس تفسیر کا شمار بہت بڑی غلطیوں میں سے ہوتا ہے جو بعض مفسرین سے سرزد ہوئی ہے اور انہوں نے آیت کے مفہوم کو مکمل طور پر مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

یہاں پر آیت کے مضمون و مفہوم کی حقیقت سے خوب آگاہی کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی دوسری آیات سے امداد حاصل کریں۔ بہت سی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام فرماتے تھے:

"وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۱"

خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے بارے میں مختلف تعبیریں دیکھی جاسکتی ہیں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَکُمْ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۲

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلاً ۳

۱ دعوت رسالت کے بدلے ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے، ہمارا اجر تو صرف پروردگار عالم کے پاس ہے۔ (سورۃ شعراء آیت 109، 127، 145، 164، 180) ۲ کہہ دے میں نے جو بھی اجر رسالت تم سے طلب کیا ہے وہ صرف تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے اور میرا اجر تو صرف خدا کے لیے ہے۔ (سورۃ سبا آیت 47) ۳ کہہ دے میں تبلیغ رسالت کے بدلے تم سے کچھ بھی اجر نہیں مانگتا مگر جو لوگ پروردگار کے راستے کو اختیار کریں۔ (سورۃ فرقان آیت 57)

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُم عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَامِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ ۱؎

جب ہم ان تینوں آیات کو زیر بحث آیت کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو نتیجہ نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک مقام پر تو اجر اور اجرت کی بالکل نفی کی گئی ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ میں اجر رسالت صرف ان لوگوں سے مانگتا ہوں جو خدا کی راہ کو اپناتے ہیں۔

تیسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ میں تم سے جو بھی اجر مانگتا ہوں وہ صرف اور صرف تمہارے فائدہ کے لیے ہے۔

زیر نظر آیت میں فرماتے ہیں میرے قریبیوں سے مؤدت ہی میری رسالت کا اجر ہے یعنی میں نے تم سے ایسا اجر رسالت طلب کیا ہے کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں کہ یہ بالکل ایسی چیز نہیں ہے جس کا فائدہ مجھے پہنچے بلکہ اس کا سو فیصد فائدہ خود تمہیں ہی ملے گا اور یہ ایسی چیز ہے جو خدا تک پہنچنے کے لیے تمہاری راہ ہموار کرتی ہے۔

اس لحاظ سے کیا اس کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مکتب کے راستے کو ان ہادیان۲؎ الٰہی اور آپؐ کے معصوم جانشینوں کے ذریعے تسلسل بخشا جائے کہ جو تمام تر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان میں سے ہوں اور چونکہ مؤدت کا مسئلہ اس تسلسل اور رابطے کی بنیاد ہے لہٰذا اس آیت میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی آیت ''مؤدت فی القربیٰ'' کے علاوہ قرآن مجید میں اور پندرہ مقامات پر ''القربیٰ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو ہر جگہ پر قریبیوں اور نزدیکیوں کے معنی میں ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ بعض لوگ اس بات پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ صرف

۱؎ کہہ دے: میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ ہی تم پر کوئی بوجھ ڈالتا ہوں۔ (سورۃ ص آیت 86)

۲؎ ہادی کی جمع معنی: ہدایت دینے والا

اسی آیت میں ''قربیٰ'' کو '' تقرب الی اللہ'' کے معنی میں منحصر کر دیا جائے اور اس کے واضح اور ظاہر معنی کو جو قرآن میں ہر جگہ استعمال ہوا ہے صرفِ نظر کر دیا جائے۔

پھر یہ نقطہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسی زیر بحث آیت کے آخر میں آیا ہے جو شخص نیک عمل بجالائے تو ہم اس کی نیکیوں میں اضافہ کریں گے کیونکہ خدا بخشنے والا اور شکر گزار ہے اور بندوں کے اعمال کی مناسب جزا عطا فرماتا ہے **وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡلَہٗ فِیۡھَا حُسۡنًا ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ شَکُوۡر.**

اس سے بڑھ کر اور کیا نیکی ہو سکتی ہے کہ انسان ہمیشہ خدائی رہبروں کے پرچم تلے رہے۔ ان کی محبت کو دل میں جگہ دے۔ ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا ہو۔ کلام الٰہی کے سمجھنے میں جہاں ابہام[1] پیدا ہو وہاں ان سے وضاحت حاصل کرے ان کے اعمال کو اپنے لیے معیارِ عمل قرار دے اور خود ان کی ذات کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دے۔

مودت فی القربیٰ روایات کی نظر سے:

مندرجہ بالا آیت کی اس تفسیر پر شاہد و ناطق وہ بہت سی روایات ہیں جو شیعہ اور سنی کتب میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی نقل ہوئی ہیں اور پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ''قربیٰ'' سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی اور مخصوص لوگ ہیں نمونے کے طور پر:

1. احمد نے '' فضائل الصحابہ'' میں اسناد کے ساتھ سعید بن جبیر سے اور انہوں نے عامر سے یوں روایت نقل کی ہے:

لَمَّا نَزَلَتۡ قُلۡ لَّآ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ، قَالُوۡا یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ ! مَنۡ قَرَابَتُکَ؟ مِنۡ ھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ وَجَبَتۡ عَلَیۡنَا مَوَدَّتُھُمۡ ؟ قَالَ

[1] مشتبہ، پوشیدگی، جو کھول کر بیان نہ ہوا ہو۔

عَلِیٌّ فَاطِمَةُ وَابُنَا هُمَا وَ قَالَهَا ثَلاثًا .

جب یہ آیت قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ط نازل ہوئی تو اصحابؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ کے وہ نزدیکی کون لوگ ہیں جن کی مودّت ہم پر واجب ہوئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹے ہیں اور اس بات کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا۔ ۱

2. "مستدرک الصحیحین" میں حضرت امام علی بن حسین علیہما السلام (زین العابدینؑ) سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام نے لوگوں سے جو خطاب فرمایا اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

اَنَا مِنْ اَهْلِ الْبَیْتِ الَّذِیْنَ افْتَرَضَ اللّٰهُ مَوَدَّتَهُمْ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فَقَالَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی لِنَبِیِّهٖ (ص) قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حَسَنًا فَاقْتِرَافُ الْحَسَنَةِ مَوَدَّتُنَا اَهْلَ الْبَیْتِ.

میں اس خاندان میں سے ہوں خدا نے جس کی مودت ہر مسلمان پر فرض کر دی ہے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا "قل لا اسئلکم علیہ اجرا" اور نیکی کمانے سے خدا کی مراد ہم اہل بیت علیہم السلام کی مودت ہے۔ ۲

3. "سیوطی" نے "در منثور" میں اسی آیت کے ذیل میں مجاہدؒ سے، انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّاالْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ط کی تفسیر میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱ احقاق الحق جلد 3 صفحہ 2 ، تفسیر قرطبی جلد 8 صفحہ 5843 ۲ مستدرک الصحیحین جلد 3 صفحہ 172 محبّ الدین طبری نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب "ذخائر العقبیٰ" کے صفحہ 137 اور ابن حجر مکی نے اپنی کتاب "صواعق محرقہ" صفحہ 101 میں نقل کیا ہے۔

اَنْ تَحفِظُوْنِیْ فِیْ اَھْلِ بَیْتِیْ وَ تَوَدُّوْھُمْ بِیْ کہ تم میرے حق کی میرے اہل بیتؑ کے بارے میں حفاظت کرو اور میری وجہ سے ان سے محبت کرو۔ [1]

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابن عباسؓ سے جو ایک اور روایت نقل ہوئی ہے وہ مسلّم نہیں ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عرب قبائل سے قرابت کی وجہ سے انہیں تکلیف نہ دی جائے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے ابن عباسؓ سے اس کے خلاف روایت نقل ہوئی ہے۔

4. ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اپنی اسناد کے ساتھ سعید ابن جبیر سے اور دوسری اسناد کے ساتھ عمر بن شعیب سے نقل کیا ہے کہ اس آیت سے مراد:

''ھِیَ قُرْبٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ'' رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی افراد ہیں۔ [2]

5. مشہور مفسر مرحوم طبرسیؒ نے حاکم حسکانی کی کتاب ''شواہد التنزیل'' سے ایک اور روایت نقل کی ہے۔ حاکم کا شمار اہل سنت کے مشہور مفسرین اور محدثین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ''ابوامامہ باہلی'' سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْاَنْبِیَاءَ مِنْ اَشْجَارٍ شَتّٰی، اَنَا وَ عَلِیٌّ مِنْ شَجَرَۃٍ وَّاحِدَۃٍ، فَاَنَا اَصْلُھَا، وَعَلِیٌّ فَرْعُھَا، وَفَاطِمَۃُ لِقَاحُھَا، وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ ثِمَارُ ھَا، وَاَشْیَا عُنَا اَوْرَاقُھَا، یہاں تک فرمایا: لَوْ اِنْ عَبَدَ عَبْدُ اللّٰہِ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃِ اَلْفَ عَامٍ، ثُمَّ اَلْفَ عَامٍ، ثُمَّ اَلْفَ عَامٍ، حَتّٰی یَصِیْرَ کَالشَّنِّ الْبَالِیْ ثُمَّ لَمْ یُدْرِکْ مُحَبَّتَنَا کَبَّہُ اللّٰہُ عَلٰی مُنْخَرِیْہِ فِی النَّارِ، ثُمَّ تَلَا قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا.

خدا نے تمام انبیاءؑ کو مختلف درختوں سے پیدا کیا ہے لیکن مجھے اور علیؑ کو ایک ہی درخت سے پیدا کیا۔ جس کی جڑ میں ہوں، شاخ علیؑ ہیں، فاطمہؑ اس کی افزائش کا ذریعہ

[1] تفسیر درمنثور جلد 6 صفحہ 7 [2] تفسیر طبری جلد 25 صفحہ 16,17

ہیں۔ حسنؑ اور حسینؑ اس کے میوے ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتے ہیں پھر فرمایا: اگر کوئی شخص صفا اور مروہ کے درمیان ہزار سال تک خدا کی عبادت کرے پھر ہزار سال اور پھر ہزار سال اور اس کی عبادت کرے اور اتنی عبادت کرے کہ سوکھ کر پرانی مشک کے مانند ہو جائے لیکن ہماری محبت اس کے دل میں نہ ہو تو خدا اسے منہ کے بل جہنم میں ڈالے گا۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ''قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط''

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس روایت کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی ہے کہ مشہور شاعر کمیت نے بھی اپنے اشعار میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے اور کہا:

وَجَدْ نَا لَكُمْ فِيْ اٰلِ حَامِيْمُ اٰيَةً تَاَوَّلَهَا مِنَّا تَقِيٌّ وَمُعْرِبٌ

تمہاری (اہل بیتؑ کی) شان میں ہمیں حم سورتوں میں ایک ایسی آیت مل گئی ہے جسے تقیہ کرنے والوں نے تاویل کر کے اور واضح بیان کرنے والوں نے کھلم کھلا بیان کیا ہے۔ ۱؎

6. ''سیوطی'' نے اپنی تفسیر در منثور میں ''ابن جریر'' سے انہوں نے ''ابی دیلم'' سے یوں نقل کیا ہے: جب حضرت علی بن حسین علیہ السلام کو قید کر کے دمشق کے دروازے پر لایا گیا تو اہل شام میں سے ایک شخص نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ قَتَلَكُمْ وَاسْتَاصَلَكُمْ (خدا کا شکر جس نے تمہیں قتل کیا اور تمہاری بیخ کنی کر دی) تو حضرت علی بن حسین علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا ہاں! پھر فرمایا حم سورتوں کو بھی پڑھا ہے؟ کہا نہیں۔ امامؑ نے کہا: کیا اس آیت کی تلاوت نہیں کی (قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط) وہ کہنے لگا تو کیا وہ '' قربیٰ '' آپ لوگ ہیں جن کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے؟ فرمایا: جی ہاں۔ ۲؎

۱؎ تفسیر مجمع البیان جلد 9 صفحہ 69 ۲؎ تفسیر در منثور جلد 6 صفحہ 7

7. زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں ایک حدیث نقل کی ہے جسے فخر الدین رازی اور قرطبی نے اپنی تفسیروں میں لکھا ہے۔ یہ حدیث بڑی صراحت کے ساتھ آل محمد علیہم السلام کے مقام کو اور ان کی محبت کی اہمیت کو بیان کر رہی ہے۔ رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

مَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ الِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَہِیْدًا

جو شخص آل محمدؑ کی محبت پر مرا وہ شہید مرا۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبّ الِ مُحَمَّدٍ مَاتَ مَغْفُوْرًا لَہٗ

خبردار رہو! جو شخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبّ الِ مُحَمَّدٍ مَاتَ تَائِبًا

خبردار رہو! جو شخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا وہ تائب مرا۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبّ الِ مُحَمَّدٍ مَاتَ مُؤْمِنًا مُسْتَکْمِلَ الْاِیْمَانِ

خبردار رہو! جو شخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا کامل الایمان مومن مرا۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبّ الِ مُحَمَّدٍ بَشَّرَہٗ مَلَکُ الْمَوْتِ بِالْجَنَّۃِ ثُمَّ مُنْکَرٌ وَ نَکِیْرٌ

خبردار رہو! جو شخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا موت کے فرشتے اسے بہشت کی خوشخبری دیں گے، پھر (قبر میں سوال کرنے والے فرشتے) منکر اور نکیر اسے خوشخبری دیں گے۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبّ الِ مُحَمَّدٍ یُزَفُّ اِلَی الْجَنَّۃِ کَمَا تُزَفُّ الْعُرُوْسُ اِلٰی بَیْتِ زَوْجِھَا خبردار رہو! جو شخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا اسے یوں آراستہ کر کے احترام کے ساتھ بہشت میں لے جایا جائے گا جس طرح دلہن کو اس کے دولہا کے گھر لے جایا جاتا ہے۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبّ الِ مُحَمَّدٍ فُتِحَ لَہٗ فِیْ قَبْرِہٖ بَا بَانِ اِلَی الْجَنَّۃِ

خبردار رہو! جو شخص آل محمدؑ کی محبت پر مرا اس کی قبر میں بہشت کے دو دروازے کھول دیئے جائیں گے

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ جَعَلَ اللّٰهُ قَبْرَهٗ مَزَارَ مَلٰٓئِكَةِ الرَّحْمَةِ

خبردار رہو! جوشخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا خدا اس کی قبر کو ملائکہ رحمت کی زیارت گاہ بنادے گا

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ عَلَى السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ

خبردار رہو! جوشخص آل محمدؑ کی محبت کے ساتھ مرا وہ اسلام کی سنت اور مسلمانوں کی جماعت پر مرے گا

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ اٰيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ۔ آگاہ رہو جوشخص آل محمدؑ کی دشمنی کے ساتھ مرا۔ قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں عرصہ محشر میں داخل ہوگا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا کہ یہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ كَافِرًا

آگاہ رہو جوشخص آل محمدؑ کی دشمنی کے ساتھ مرے گا وہ کافر ہو کر مرے گا۔

اَلاَ وَمَنْ مَّاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ لَمْ يَشُمَّ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ

آگاہ رہو جوشخص آل محمدؑ کی دشمنی کے ساتھ مرے گا وہ بہشت کی خوشبو کو نہیں سونگھ پائے گا۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ فخر الدین رازی اس حدیث شریف کو جسے صاحب کشاف نے حدیث مرسل مسلم کے نام سے یاد کیا ہے۔ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"آل محمدؑ وہ لوگ ہیں جن کے امور کی بازگشت آپؐ ہی کی طرف ہوتی ہے جن لوگوں کا رابطہ زیادہ محکم اور کامل ہوگا انہی کا "آل" میں شمار ہوگا اور اس میں شک نہیں کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا، حضرت علی علیہ السلام، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کا رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے محکم ترین رشتہ ہے۔

[1] تفسیر کشاف جلد 4 صفحہ 221,220، تفسیر فخر الدین رازی جلد 27 صفحہ 166,165، تفسیر قرطبی جلد 8 صفحہ 5843، تفسیر ثعلبی جلیل بن عبداللہ سے اسی آیت کے دلائل ہیں (منقول از المراجعات خط 19)

یہ بات مسلمات میں سے ہے اور متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ بنابریں لازم ہے کہ ہم انہیں ''آل رسول علیہم السلام'' سمجھیں'' آگے چل کر کہتے ہیں۔

کچھ لوگوں نے آل کے مفہوم میں اختلاف کیا ہے۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے قریبی رشتہ دار آل رسول علیہم السلام ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ آپؐ کی امت آپؐ کی آل ہے۔ اگر ہم اس لفظ کو پہلے معنی پر محمول کریں تو اس سے مراد صرف اور صرف مذکورہ بزرگ ہستیاں ہیں اور اگر اس سے مراد امّت یعنی وہ افراد ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا تو پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نزدیکی رشتہ دار آپ کی آل سمجھے جائیں گے۔ بنابریں ہر لحاظ سے یہ ہستیاں آپؐ کی آل ہیں البتہ ان کے علاوہ لوگ آل میں داخل ہیں یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔''

اس کے بعد فخرالدین رازی صاحب کشاف سے یوں نقل کیا ہے:

''جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم آپؐ کے قریبی رشتہ دار کون ہیں جن کی محبت ہم پر فرض ہوئی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ علی و فاطمہ علیہا السلام اور ان کے دو فرزند ہیں۔''

پس معلوم ہوا یہ چار بزرگوار ہستیاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذوی القربی ہیں اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر ضروری ہے کہ ان کا انتہائی احترام کیا جائے۔

فخرالدین رازی مزید کہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر مختلف دلائل ہیں:

(i) ''**اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی**'' کا جملہ کہ جس کا طرز استدلال بیان ہو چکا ہے اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو حضرت فاطمہؑ سے محبت تھی اور ان کے بارے میں فرمایا: **فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ یُؤْذِیْنِیْ مَا یُؤْذِیْهَا** فاطمہؑ میرے بدن کا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف دے گی وہ مجھے تکلیف دے گی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی متواتر حدیثوں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپؐ علی، حسن اور حسین علیہم السلام سے محبت فرماتے تھے اور جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ان کی محبت تمام امت پر واجب ہے چونکہ خدا سورہ اعراف آیت 158 میں فرماتا ہے:

وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ رسول خدا کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

نیز فرماتا ہے فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ جو لوگ فرمان رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں انہیں عذاب الٰہی سے ڈرنا چاہیے۔ (سورہ نور آیت 63)

سورہ آل عمران آیت 31 میں ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ خدا (بھی) تم کو دوست رکھے گا۔

ساتھ ہی اس کا یہ فرمان بھی ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمہارے لئے رسولؐ خدا کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ (سورۃ احزاب آیت 21)

(ii) ''آل'' کے لئے دعا ایک عظیم اعزاز ہے لہٰذا یہ دعا تشہد کے اختتام پر موجود ہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْحَمْ مُحَمَّدًا وَ اٰلَ مُحَمَّدٍ اس قسم کی عظمت اور احترام آل کے علاوہ اور کسی کے بارے میں نہیں نظر آتا لہٰذا ان سب دلائل کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آل محمدؐ کی محبت واجب ہے۔

آخر میں فخر الدین رازی اپنی گفتگو کو امام شافعی کے ان مشہور اشعار پر ختم کرتے ہیں:

يَارَاكِبًا قِفْ بِالْمُحَصَّبِ مِنْ مِنٰى وَاهْتِفْ بَاكِنَ خَيْفِهَا وَالنَّاهِضَ
سَحَرًا اِذَا فَاضَ الْحَجِيْجُ اِلٰى مِنٰى فَيْضًا كَمَا نَظْمَ الْفُرَاتُ الْفَائِضُ
اِنْ كَانَ رَافِضًا حُبُّ اٰلِ مُحَمَّدٍ فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اِنِّیْ رَافِضٌ

اے حج کے لئے جانے والے سوار! جہاں پر منیٰ کے نزدیک رمی جمرات کے لئے

کنکریاں اکٹھا کرتے ہیں اور جو خانہ خدا کے زائرین کا عظیم اجتماعی مرکز ہے تو وہاں پر ٹھہر جا ان لوگوں کو آواز دے جو مسجد خیف میں مصروفِ عبادت ہیں یا چل رہے ہیں۔

اس وقت پکار جب بوقت سحر حجاج مشعر الحرام سے منیٰ کی جانب چل پڑتے ہیں اور عظیم اور ٹھاٹھیں مارتے دریا کی مانند سرزمین منیٰ میں داخل ہوتے ہیں۔

ہاں تو باآواز بلند کہہ دے کہ اگر آل محمد علیہم السلام کی محبت کا نام رفض ہے تو تمام جن وانس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔ [1] (تفسیر فخر الدین رازی جلد 27 صفحہ 166)

جی ہاں یہ ہے آل محمد علیہم السلام کا مقام اور ان کی قدر و منزلت ہم جن کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور جنہیں ہم نے اپنا دین اور دنیا کا رہبر تسلیم کیا ہے۔ ہم انہیں اپنے لئے اسوہ حسنہ اور نمونہ کامل سمجھتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی امامت کے ذریعے راہ نبوت کا تسلسل باقی ہے۔

البتہ مندرجہ بالا احادیث کے علاوہ اسلامی کتابوں میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں لیکن ہم اختصار پر قناعت کرتے ہوئے اس نکتے کو بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ علم کلام کی بعض کتابوں مثلاً "احقاق الحق" اور اس کی مبسوط شرح میں قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کی تفسیر میں مذکورہ بالا مشہور حدیث اہل سنت کی پچاس سے زائد کتابوں سے نقل کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کس قدر مشہور و معروف ہے۔ البتہ کتب شیعہ میں بھی اہل بیت علیہم السلام کے حوالے سے بہت سی کتبِ حدیث میں نقل کی گی ہے۔

[1] رَفْضٌ پھینکنا اور چھوڑنا کے معنی میں آتا ہے۔ بعض مخالفین تعصب کی بنا پر شیعوں کو رافضی کہتے ہیں۔

چند نکات:

حضورؐ کا اجر رسالت طلب کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ آپ روپے پیسے سے میری کوئی مدد نہ کریں اور نہ مجھے کوئی اس قسم کا اجر دیں بلکہ میرا اجر اور میری امداد یہ ہے کہ میرے قریبیوں کے ساتھ دوستی رکھیں حالانکہ اس محبت کا نفع بھی امت کے لیے ہی ہے چنانچہ دوسرے مقام پر واضح ارشاد ہے:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُم کہہ دیجیے کہ میں نے جو کچھ تم سے بطور اجر طلب کیا ہے وہ تمہاری بھلائی کے لئے ہے۔(سورۃ سبا 34 آیت 47)

گویا جس طرح تبلیغ رسالت حضورؐ کی طرف سے امت پر ایک احسان عظیم تھا۔ اسی طرح جس چیز کو رسالت کا اجر قرار دیا وہ بھی چونکہ امت کی بھلائی کی خاطر تھا۔ گویا اجر رسالت حضورؐ کی جانب سے امت پر دوہرا احسان ہے کیونکہ اس طریقہ سے امت کے لئے تا قیامت گمراہی سے بچنے کی ضمانت دی گئی ہے جیسا کہ حدیث ثقلین میں اس کی وضاحت موجود ہے پس جن لوگوں نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی مانا اور اجر رسالت یعنی مودۃ فی القربیٰ سے گریز کیا۔ انہوں نے دوہرا نقصان اٹھایا کیونکہ ایک طرف تو وہ اجر رسالت ادا نہ کر کے اسلام لانے کے ثواب سے محروم ہو گئے اور دوسری طرف چونکہ اس کا نفع انہی کو حاصل ہوتا اور وہ تا قیامت گمراہی سے بچتا تھا۔ پس آل رسول علیہم السلام سے محبت نہ کر کے وہ ایمان واسلام میں استقامت نہ پیدا کر سکے اور قیامت تک راہ مستقیم سے بھٹکا رہنا ان کی تقدیر بن گیا۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ بلا اجرت کام کرنے والا اس سے افضل ہوتا ہے جو اجرت لے کر کام کرے لہٰذا اس سے دوسرے انبیاءؑ کی برتری ثابت

ہوتی ہے جنہوں نے بلا اجرت تبلیغ و رسالت کا فریضہ انجام دیا؟

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ وہ اجرت خلوص اور قربت میں مخل ہوتی ہے جس کا نفع اجیر (اجرت لینے والے) کو پہنچتا ہو۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کا نفع خود امّت کے لیے مخصوص ہے کہ ان کا قیامت تک گمراہی سے بچنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ اجرت درحقیقت اجرت نہیں بلکہ حضورؐ کی طرف سے امت پر دوہرا احسان ہے۔
ثانیاً یہ کہ حضورؐ نے اجر نہیں مانگا بلکہ اجر رسالت کا طلب کرنا جملہ فرائض نبوت کی طرح حضورؐ پر ایک فریضہ کی حیثیت سے عائد کیا گیا تھا جس کی تعمیل و تبلیغ نبوت کا ایک حصہ تھی۔

لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ انبیاءؑ کی عترت کی محبت کو یہ حیثیت کیوں نہ دی گئی اور حضورؐ کی آل کو یہ خصوصیت کس لیے ملی؟

تو اس کا واضح حل یہی ہوسکتا ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ کی آلؑ اطہار کو خصوصی طور پر یہ نمایاں شرف حاصل ہے کہ مودة فی القربیٰ فرض کر کے خداوند کریم نے ان کے متعلق ضمانت دی ہے کہ یہ کسی وقت بھی دینی تقاضوں سے انحراف کر کے باطل کے سامنے سرنگوں نہ ہوں گے۔ ان کی محبت اور مودّت ہی اسلام کے صحیح پرستاروں کے لیے باطل پرستوں کی چیرہ دستیوں سے بچنے کا سامان فراہم کرنے کا بلند کردار ادا کرے گی۔
مودة فی القربیٰ کا وجوب تبلیغ رسالت کا اہم جز ہے کیونکہ تا قیامت بقاءِ رسالت اس سے وابستہ ہے اور آیت مجیدہ سے بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضورؐ کے بعد امام امت بھی آلِ رسولؐ سے ہونا چاہیے جن کی مودّت فرض ہے کیونکہ اگر اطاعت کسی اور کی فرض ہو اور مودّت کسی اور کی واجب ہو تو بعض اوقات ان میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ پس جن کی مودت فرض ہے انہی کی اطاعت فرض ہونا ضروری ہے لہٰذا مودت فی القربیٰ کے

فریضہ کی ادائیگی صحیح طور پر اسی وقت ہوسکتی ہے جب انہی کو اپنا پیشوا، ہادی اور امام مانا جائے اور انہی کو حضورؐ کا صحیح قائم مقام تسلیم کیا جائے۔

ایک طرف حدیث نبویؐ میں ہے:

مَنْ مَّاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَہِیْدًا جو آل محمدؐ کی محبت میں مرتا ہے وہ شہید ہوتا ہے۔

دوسری طرف حدیث ہے:

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِیْتَةً جَّاهِلِیَّةً جو شخص امام زمانہؑ کی معرفت کے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

پس پہلی حدیث کا منطوق اور دوسری حدیث کا مفہوم ایک دوسرے سے اس وقت مطابقت رکھیں گے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ امت کا امام اور ہادی آل محمدؐ سے ہو۔ جس کی محبت واجب ولازم ہے۔

مشہور مفسر ''آلوسی'' سے کچھ باتیں:

یہاں پر ایک سوال جو بہت سے لوگوں کے پیش نظر ہے اور مشہور مفسر آلوسی نے اسے شیعوں پر ایک اعتراض کی صورت میں اپنی تفسیر روح المعانی میں پیش کیا ہے۔ان کی گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

بعض شیعوں نے اس آیت کو حضرت علی علیہ السلام کی امامت پر دلیل کے طور پر پیش کیا اور کہا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی محبت واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہوتی ہے اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے اور جس کی اطاعت واجب ہوتی ہے وہ امام ہوتا ہے۔اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام مقام امامت کے مالک ہیں اور

اسی آیت کوانہوں نے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔لیکن ان کی یہ بات کئی لحاظ سے قابل اعتراض ہے:

پہلے تو یہ کہ اس آیت کو محبت کے وجوب پر دلیل ہم اس وقت مانیں گے۔جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ آیت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اقرباء کی محبت کے معنی میں ہے جب کہ بہت سے مفسرین نے اس معنی کو تسلیم نہیں کیا۔ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ بات مقام نبوت کے شایان شان نہیں ہے کیونکہ اس سے آپؐ کی ذات پر تہمت آتی ہے کہ آپؐ کا یہ مقام دنیا پرستوں کے کام جیسا ہوگا پہلے تو وہ کسی کام کو شروع کر دیتے ہیں پھر اس کے فوائد اور منافع کا اپنی اولاد اور رشتہ داروں کے لئے مطالبہ کرتے ہیں۔یہ بات سورۃ یوسف کی آیت 104 کے بھی منافی ہے۔جس میں ارشاد ہے وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (اے پیغمبرؐ) اور تم ان لوگوں سے اس کی اجرت طلب نہیں کرتے۔

دوسرے یہ کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ محبت کا وجوب اطاعت کی دلیل بن سکے کیونکہ ابن بابویہ اپنی کتاب ''اعتقادات'' میں کہتے ہیں کہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ علویوں کی محبت لازم ہے جب کہ وہ ان سب کو واجب الاطاعت نہیں سمجھتے۔

تیسرے یہ کہ ہم یہ بات بھی نہیں مانتے جس شخص کی اطاعت واجب ہوتی ہے وہ امام یعنی زعامت کبریٰ کا مالک بھی ہو۔ورنہ پیغمبرؐ اپنے زمانے میں امام ہوتے جبکہ ہم جناب طالوت کی داستان میں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک گروہ کے امام ہوئے اس زمانے میں ایک اور پیغمبر بھی موجود تھے۔

چوتھے یہ کہ آیت کا تقاضا ہے کہ تمام اہل بیت واجب الاطاعت ہوں اور اسی بنا پر وہ سب امام ہوں جبکہ امامیہ کا ایسا عقیدہ نہیں ہے۔(تفسیر روح المعانی جلد 25 صفحہ 28)

اعتراض پر تحقیقی نظر:

آیتِ مودّت اور دوسری آیات میں بہت سی موجود قرائن میں غور کرنے سے ان میں سے کئی اعتراض کا جواب واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ یہ محبت کوئی معمولی اور عام چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو نبوت کی جزا اور رسالت کا اجر ہے اور فطرۃً اس محبت کو بھی نبوت و رسالت کے ہم پلہ ہونا چاہیے۔ تاکہ اس کا اجر قرار پا سکے۔

پھر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ اس محبت کا فائدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو خود آنحضرتؐ کو پہنچے بلکہ اس کا سو فیصد فائدہ خود مومنین کو پہنچتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا معنوی امر ہے جو مسلمانوں کی ہدایت کے ارتقاء میں مؤثر ہے

اس طرح سے اگرچہ آیت کے ظاہر سے محبت کے وجوب کے علاوہ اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی لیکن اس محبت کے وجوب کے لئے جو قرائن مذکور ہوئے ہیں وہ مسئلہ امامت کو واضح کرتے ہے کہ جو مقام نبوت اور رسالت کا مددگار اور پشت پناہ ہے۔ مندرجہ بالا مختصر سی وضاحت کے بعد ہم مذکورہ اعتراضات کا جواب پیش کرتے ہیں۔

پہلے: یہ کہ آلوسی کہتے ہیں کہ بعض مفسرین اس آیت سے مودت اہل بیتؑ مراد نہیں لیتے یہ بات ماننی پڑے گی کہ پہلے سے کیے ہوئے فیصلے اور رسومات ایسا کرنے میں حائل ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ تو ’’قربی‘‘ کا معنی ’’خدا کا تقرب کرتے ہیں جبکہ قرآن مجید کی تمام آیات میں جہاں جہاں بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے وہاں پر ’’قریبی رشتہ دار‘‘ کے معنی میں ہے۔

بعض لوگ اس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی عرب قبیلہ کے ساتھ رشتہ داری سے تفسیر کرتے ہیں جبکہ یہ تفسیر آیت کے نظام کو مکمل طور پر درہم برہم کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اجر رسالت ان لوگوں سے طلب کیا جا رہا ہے جنہوں نے رسالت کو قبول کر

لیا اور جو لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رسالت کو قبول کر چکے ہوں پھر کیا ضرورت ہے کہ ان سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رشتہ داری کا پاس کرتے ہوئے انہیں تکلیف دینے سے باز رہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ جب بے انتہا روایات آیت کو اہل بیت علیہم السلام کی ولایت سے تفسیر کرتی ہیں انہیں چھوا تک نہ جائے۔

اس لئے یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ مفسرین کے اس گروہ نے ہرگز خالی الذہن ہو کر آیت کی تفسیر نہیں کی ورنہ کوئی پیچیدہ بات آیت کے مطلب میں موجود نہیں ہے

اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مودت اہل بیت علیہم السلام کا تقاضا نہ تو مقام نبوت کے منافی ہے اور نہ ہی اسے دنیا پرستوں کے طریقہ کار پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ معنی سورۃ یوسف کی آیت 104 سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے جو ہر قسم کی اجرت کی نفی کر رہی ہے۔ کیونکہ اہل بیت علیہم السلام کی محبت کا اجر حقیقت میں ایسا اجر نہیں ہے جس سے خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا کوئی فائدہ ہو بلکہ اس میں خود مسلمانوں کا اپنا فائدہ ہے۔

دوسرے: یہ صحیح ہے کہ عام اور معمولی محبت اطاعت کے وجوب کی ہرگز دلیل نہیں بن سکتی لیکن جب ہم اس بات کو پیش نظر لاتے ہیں کہ یہ محبت کوئی عام محبت نہیں بلکہ نبوت و رسالت کے ہم پلہ ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا وجوب بھی اسی میں پوشیدہ ہے اور یہیں پر بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابن بابویہ (شیخ صدوق) کی گفتگو بھی اس امر کے منافی نہیں ہے۔

تیسرے: یہ ٹھیک ہے کہ ہر اطاعت کا وجوب زعامت کبریٰ اور امامت کی دلیل نہیں بن سکتی لیکن یہ بات بھی تو مدنظر ہونی چاہیے کہ جس اطاعت کا وجوب رسالت کا اجر قرار پا رہا ہے وہ امام کے علاوہ کسی اور کے شایان شان نہیں ہو سکتی۔

چوتھے: یہ بات مسلم ہے کہ امام بمعنی رہبر و پیشوا ہر دور میں صرف ایک ہی شخصیت ہوسکتی ہے اور بس۔ لہٰذا تمام اہل بیت علیہم السلام کی امامت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آیت کا معنی سمجھنے میں روایت کے تعلق کو بھی بہر صورت پیش نظر رکھنا چاہیے۔

پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آلوسی نے ذاتی طور پر مودت اہل بیتؑ کو بہت بڑی اہمیت دی ہے اور مندرجہ بالا بحث سے چند سطور پہلے وہ لکھتے ہیں: حق بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اقرباء کی محبت بوجہ ان کے پیغمبرؐ کا رشتہ دار ہونے کے واجب ہے اور قرابت جتنی زیادہ قوی ہوگی محبت کا وجوب اس قدر بیشتر ہوگا۔

آخر میں کہتے ہیں: اس مؤدت کے آثار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اقرباء کی تعظیم، احترام اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض لوگ اس کے بارے میں سستی سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ اقرباء پیغمبرؐ سے محبت کو ایک قسم کی رافضیت سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کہتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہوں جو امام شافعیؒ نے اپنے جاذب اور دل نشین اشعار میں کہا ہے۔

پھر وہ امام شافعی کے مذکورہ اشعار نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: اس کے ساتھ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ میں اہل سنت کے بزرگوں کے عقائد سے باہر نہیں ہوں جو وہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں رکھتے ہیں اور ان کی محبت کو بھی واجب سمجھتا ہوں۔ (روح المعانی جلد 25 صفحہ 28)

کشتی نجات:

صاحب تفسیر کبیر فخر الدین رازی نے اسی بحث کے ذیل میں ایک نکتے کو بیان کیا ہے اور اسے اپنا پسندیدہ نکتہ قرار دیا ہے اور مفسر آلوسی نے بھی اسے ''ایک لطیف نکتہ'' کے عنوان سے اپنی تفسیر روح المعانی میں انہیں سے نقل کیا ہے یہ وہ نکتہ ہے جو ان کے خیال کے

مطابق بہت سے تضادات کو برطرف کر رہا ہے۔

ایک طرف تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِى كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجٰى میرے اہل بیتؑ کشتی نوح کی مانند ہیں جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا۔(تفسیر نمونہ زیر نظر آیت کی بحث میں)

دوسری طرف ارشاد فرماتے ہیں:

اَصْحَابِىْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمْ اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔(تفسیر نمونہ زیر نظر آیت کی بحث میں)

اب ہم فرائض کی ادائیگی کے سمندر میں گرفتار ہیں۔شکوک و شبہات اور خواہشات نفسانی کی موجیں ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جسے سمندر عبور کرنا ہوتا ہے اسے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک کشتی جو ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک ہو اور دوسرے چمکدار اور روشن ستارے جن کے ذریعے کشتی کی راہوں کو متعین کیا جاتا ہے۔ جب انسان کشتی پر سوار ہو جائے اور اپنی نگاہیں ستاروں پر لگائے رکھے تو نجات کی امید ہو سکتی ہے۔اسی طرح اہل سنت میں سے جو شخص آل محمدؐ کی محبت کی کشتی پر سوار ہو کر ستاروں جیسے اصحابؓ پر اپنی نگاہیں جمائے رکھے تو امید ہے کہ خدا اسے دنیا و آخرت کی سلامتی اور سعادت سے بہرہ مند کر دے۔(تفسیر کبیر فخر الدین رازی جلد 27 صفحہ 167)

لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ تشبیہ اگرچہ ظاہری طور پر دلکش اور جاذب نظر تو ہے لیکن صحیح معنوں میں درست نہیں ہے کیونکہ ایک تو کشتی نوح اس وقت نجات کا ذریعہ بنی جب طوفان کے پانی نے ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور وہ ہمیشہ چلتی رہی تھی۔ دوسری عام کشتیوں کے مانند کسی ایک منزل مقصود کی طرف اس کی حرکت نہیں تھی کہ ستاروں کے ذریعے اس منزل کا تعین کیا جاتا۔ بلکہ منزل مقصود خود کشتی ہی تھی اور یہ اس وقت تک

اپنے حال پر قائم رہی جب تک طوفان کا پانی ختم نہیں ہوگیا اور کشتی کوہ جودی پر ٹھہر نہیں گئی اور کشتی کے سواروں نے نجات نہیں پالی۔

دوسرے یہ کہ اہل سنت بھائیوں کی کتابوں میں درج ایک روایت میں جو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے منقول ہے یوں آیا ہے:

اَلنُّجُومُ اَمَانٌ لِاَهْلِ الْاَرْضِ مِنَ الْغَرَقِ وَ اَهْلُ بَيْتِي اَمَانٌ لِاُمَّتِي مِنَ الْاِخْتِلَافِ فِي الدِّيْنِ . ستارے اہل زمین کے لیے ان کے غرق ہونے سے امان ہیں اور میرے اہل بیتؑ میری امت کے لیے دین میں اختلاف سے امان ہیں۔(مستدرک حاکم جلد 3 صفحہ 149)

حاکم کہتے ہیں کہ **هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْاِسْنَادِ وَلَمْ يُخْرِجَاهُ** یہ حدیث معتبر ہے لیکن بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے۔

وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا کی تفسیر:

”جو شخص کوئی نیکی کمائے گا ہم اس کی اچھائی میں اضافہ کردیں گے۔“ اس جملے میں لفظ ”اقترف“ اصل میں ”قرف“ (بروزن ”حرف“) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے درخت کی اضافی چھال کا اتار لینا یا زخم کی اضافی کھال کا اتار لینا کہ بعض اوقات جس سے صحت وتندرستی حاصل ہوجاتی ہے۔ بعد میں یہ کلمہ اکتساب (کمانے اور حاصل کرنے) کے معنی میں استعمال ہونے لگا خواہ یہ اکتساب اچھا ہو یا برا۔ لیکن راغب کہتے ہیں کہ یہ کلمہ خوبی کی نسبت برائی کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے (اگرچہ اس آیت میں خوبی کے لیے استعمال ہوا ہے) یہی وجہ ہے کہ عربوں میں ایک ضرب المثل مشہور ہے: **اَلْاِعْتِرَافُ يَذِيْلُ الْاِقْتِرَافَ** گناہ کا اعتراف گناہ کو مٹا دیتا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ابن عباسؓ اور ایک اور مقدم مفسر ”سدّی“ سے منقول ہے

کہ آیت میں "اِقْتِرَافُ الْحَسَنَۃِ" سے مراد آلِ محمد علیہم السلام کی موَدت ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں جو حضرت امام حسن علیہ السلام کے حوالے سے بیان ہوئی ہے:
اِقْتِرَافُ الْحَسَنَۃِ مَوَدَّتُنَا اَھْلَ الْبَیْتِ نیکی کمانے سے مراد ہم اہل بیتؑ کی موَدت ہے۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تفسیروں کی مراد اکتساب حسنہ کے معنی کو اہل بیتؑ کی مودت میں محدود کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا نہایت وسیع اور عمومی معنی ہے۔ لیکن چونکہ یہاں پر ذوی القربیٰ کی موّدت کے بعد آیا ہے لہٰذا اس کا واضح ترین مصداق یہی موّدت ہے۔

یہ آیت مدنی آیات میں سے ہے جبکہ سورۃ شوریٰ مکی ہے۔ لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ چار آیات آیت 23 تا 26 مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم آغاز میں بتا چکے ہیں کہ ان آیات کی شان نزول ہمارے اس مدعا کی دلیل ہے اور وہ روایات بھی اسی بات کے لیے اچھی دلیل ہیں جن کے مطابق اہل بیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام مراد ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا سیدہ طاہرہؑ سے عقد مدینہ منورہ میں انجام پایا اور مشہور روایات کی بنا پر حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت تیسری اور چوتھی ہجری میں ہوئی۔

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں تفسیر صافی اور تفسیر قرطبی

خلاصہ

☆ جب حضورؐ حجۃ الوداع سے واپس مدینہ پہنچے تو آپؐ نے بحکم خدا یہ آیت تلاوت کی تو فوراً منافقین نے خیال کیا کہ آپؐ نے اپنے اہل بیتؑ کو نوازنے کے لیے یہ فرمایا ہے۔

مودت اہل بیتؑ اجر رسالت ہے:

ذوی القربیٰ کی مودّت درحقیقت رسولؐ پاک کی رسالت و نبوت کو تسلیم کرنا ہے جو کہ انسان کی اپنی سعادت کا ذریعہ ہے اور اس کا نتیجہ خود انسان کی طرف ہی لوٹتا ہے۔

مودت فی القربیٰ کی وضاحت:

اس سلسلے میں تقریباً چار مشہور تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔

(i) ذوی القربیٰ سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیتؑ ہیں۔

(ii) رسالت کا اجر یہی ہے کہ تم ان چیزوں کو دوست رکھو جو تمہیں خدا کے قرب کی دعوت دیتی ہیں۔

(iii) تم اجر رسالت کے طور پر اپنے قریبی رشتہ داروں کو دوست رکھو اور صلہ رحمی بجالاؤ۔

(iv) تم سے جو میری قرابت ہے اس کی حفاظت کرو اور اسے محفوظ رکھو۔

اس آیت ''مؤدت فی القربیٰ'' کے علاوہ قرآن مجید میں اور پندرہ مقامات پر ''القربیٰ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو ہر جگہ پر قریبیوں اور نزدیکیوں کے معنی میں ہے۔ لہذا ذوی القربیٰ سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیتؑ ہیں۔

مودّت فی القربیٰ روایات کی نظر سے:

بہت سی روایات میں ہے کہ ''قربیٰ'' سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی اور مخصوص لوگ ہیں۔ ''فضائل الصحابہ'' کے مطابق اصحابؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے وہ نزدیکی کون لوگ ہیں کہ جن کی مودّت ہم پر واجب ہوئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹے ہیں اور اس بات کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا۔

زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں ایک حدیث نقل کی ہے جسے فخر الدین رازی اور قرطبی نے اپنی تفسیروں میں لکھا ہے۔ یہ حدیث بڑی صراحت کے ساتھ آل محمد علیہم السلام کے مقام کو اور ان کی محبت کی اہمیت کو بیان کر رہی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **من مات علی حب ال محمد مات شهیدا ....** الخ

''آل'' کے لئے دعا ایک عظیم اعزاز ہے لہٰذا یہ دعا تشہد کے اختتام پر موجود ہے: ''**اللهم صل علی محمد و علی ال محمد ...**'' اور اس قسم کی عظمت اور احترام آل کے علاوہ اور کسی کے بارے میں نہیں نظر آتا لہٰذا ان سب دلائل کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آل محمدؐ کی محبت واجب ہے۔ آخر میں فخر الدین رازی اپنی گفتگو کو امام شافعی کے مشہور اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

اجر رسالت کا نفع خود امّت کے لیے مخصوص ہے کہ ان کا قیامت تک گمراہی سے بچنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ اجرت در حقیقت اجرت نہیں بلکہ حضورؐ کی طرف سے امت پر دوہرا احسان ہے۔

ثانیاً یہ کہ حضورؐ نے اجر نہیں مانگا بلکہ اجر رسالت کا طلب کرنا جملہ فرائض نبوت کی طرح حضورؐ پر ایک فریضہ کی حیثیت سے عائد کیا گیا تھا جس کی تعمیل تبلیغ نبوت کا ایک حصہ تھی

حضرت رسالتمآبؐ کی آلؑ اطہار کو خصوصی طور پر یہ نمایاں شرف حاصل ہے کہ مودۃ فی القربیٰ فرض کر کے خداوند کریم نے ان کے متعلق ضمانت دی ہے کہ یہ کسی وقت بھی دینی تقاضوں سے انحراف کر کے باطل کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے۔

اس حدیث (**من مات علی ....**) کا منطوق اور اس (**من مات ولم یعرف امام زمانہ مات ....**) کا مفہوم اس وقت ایک دوسرے کے مطابق ہو سکتے ہیں کہ جب امت کا امام اور ہادی آل محمدؐ سے ہو جس کی محبت واجب و لازم ہے۔

مشہور مفسر آلوسی کے اعتراضات پر تحقیقی نظر:

(i) قرآن مجید کی تمام آیات میں جہاں جہاں بھی لفظ قربیٰ استعمال ہوا ہے وہاں پر ''قریبی رشتہ دار'' کے معنی میں ہے پھر اس سے مراد ''تقرب خدا'' کیوں لیا جائے۔ تعجب کی بات نہیں کہ روایات کی ایک کثیر تعداد کو چھوا تک نہ جائے جن میں قربیٰ کا معنی اہل بیتؑ پیغمبرؐ ہے۔

یہ واضح رہے کہ مودت اہل بیت علیہم السلام کا تقاضا نہ تو مقام نبوت کے منافی ہے اور نہ ہی اسے دنیا پرستوں کے طریقہ کار پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ معنی سورۃ یوسف کی آیت 104 سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے جو ہر قسم کی اجرت کی نفی کر رہی ہے۔ کیونکہ اہل بیت علیہم السلام کی محبت کا اجر حقیقت میں ایسا اجر نہیں ہے جس سے خود رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا کوئی فائدہ ہو بلکہ اس میں خود مسلمانوں کا اپنا فائدہ ہے۔

(ii) یہ صحیح ہے کہ عام اور معمولی محبت اطاعت کے وجوب کی ہرگز دلیل نہیں بن

سکتی لیکن یہ محبت کوئی عام محبت نہیں بلکہ نبوت ورسالت کے ہم پلہ ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ اطاعت کا وجوب بھی اسی میں پوشیدہ ہے اور یہیں پر بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابن بابویہ (شیخ صدوق) کی گفتگو بھی اس امر کے منافی نہیں ہے۔

(iii) یہ ٹھیک ہے کہ ہر اطاعت کا وجوب زعامت کبریٰ اور امامت کی دلیل نہیں بن سکتی لیکن جس اطاعت کا وجوب رسالت کا اجر قرار پا رہا ہے وہ امام کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔

(iv) امام بمعنی رہبر و پیشوا ہر دور میں صرف ایک ہی شخصیت ہو سکتی ہے اور بس۔ لہٰذا تمام اہل بیت علیہم السلام کی امامت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ آیت کا معنی سمجھنے میں روایت کے تعلق کو بھی ہر صورت پیش نظر رکھنا چاہیے۔

پھر یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آلوسی نے ذاتی طور پر مودت اہل بیتؑ کو بہت بڑی اہمیت دی ہے۔ لکھتے ہیں: ''حق بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اقرباء کی محبت بوجہ ان کے پیغمبرؐ کا رشتے دار ہونے کے واجب ہے اور قرابت جتنی زیادہ قوی ہوگی محبت کا وجوب اس قدر بیشتر ہوگا۔''

کشتی نجات:

دو احادیث :''میرے اہل بیتؑ کشتی نوحؑ کی مانند ہیں جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا'' اور ''میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے'' کے متعلق فخر الدین رازی کی شاعرانہ تشبیہ اگرچہ ظاہری طور پر دلکش اور جاذب نظر تو ہے لیکن صحیح معنوں میں درست نہیں ہے کیونکہ کشتی نوحؑ عام کشتیوں کے مانند کسی ایک

منزل مقصود کی طرف اس کی حرکت نہیں تھی کہ ستاروں کے ذریعے منزل کا تعین کیا جاتا۔ بلکہ منزل مقصود خود کشتی ہی تھی اور یہ اس وقت تک اپنے حال پر قائم رہی جب تک کہ طوفان کا پانی ختم نہیں ہوگیا اور کشتی کوہ جودی (جودی پہاڑ) پر ٹھہر نہیں گئی اور کشتی کے سواروں نے نجات نہیں پالی۔

وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً...“ کی تفسیر:

آیت میں ”اقتراف حسنة “ سے مراد آل محمد علیہم السلام کی مؤدت ہے۔

یہ آیت مدنی آیات میں سے ہے جبکہ سورة شوریٰ مکی ہے۔ لیکن بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ چار آیات آیت 23 تا 26 مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

ان آیات کی شان نزول ہمارے اس مدعا کی دلیل ہے۔ وہ روایات بھی اچھی دلیل ہیں جن کے مطابق اہل بیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام مراد ہیں۔

کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا سیدہ طاہرہؑ سے عقد مدینہ منورہ میں انجام پایا اور مشہور روایات کی بنا پر حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت تیسری اور چوتھی ہجری میں ہوئی۔

خود آزمائی

1. آیت مودّت کا شانِ نزول بیان کریں نیز تفسیر صافی کی روایت پر روشنی ڈالیں؟

2. آیت مودّت سے آئمہ معصومینؑ کی پیشوائی اور رہبری کی دلیل کیسے قائم کی جا سکتی ہے؟

3. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اجر کیا ہے قرآن کی آیت کا حوالہ دیں؟

4. مودّت فی القربیٰ کے سلسلے میں کون سی چار مشہور تفسیریں بیان ہوئی ہیں؟

5. مودّت فی القربیٰ کی آیت کے علاوہ قرآن مجید میں القربیٰ کا لفظ کتنے مقامات پر استعمال ہوا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

6. مندرجہ ذیل سنی اور شیعہ کتب کی روشنی میں قربیٰ سے کیا مراد لیا گیا ہے؟

(i) فضائل الصحابہ (ii) مستدرک الصحیحین

(iii) تفسیر درمنثور (iv) تفسیر ابن جریر طبری

(v) تفسیر مجمع البیان

7. زمخشری کی تفسیر کشاف میں آل محمد علیہم السلام کے مقام اور ان کی محبت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کوئی سے پانچ جملے بیان کریں؟

8. بغیر اجرت کام کرنے والا اس سے افضل ہوتا ہے جو اجرت لے کر کام کرے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رسالت کی اجرت کیوں مانگی؟

9. گزشتہ انبیاءؑ کی عترت کی محبت کو ان کی امتوں کے لیے کیوں نہیں واجب قرار دیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل کو یہ خصوصیت کیسے ملی؟

10. آیت مودّت کے متعلق مفسر آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں کیا باتیں بیان کی ہیں کیا اس کا نقطہ نظر درست ہے؟

11. آیت مودّت کے ذیل میں فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں کون سی دو احادیث کا خصوصیت سے ذکر کیا؟

12. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کریں جس میں یہ مفہوم ملتا ہے ستارے اہل زمین کے لئے امان ہیں اور میرے اہل بیتؑ میری امت کے لئے امان ہیں نیز کتاب کا حوالہ دیں؟

13. آیت مودّت سورۃ شوریٰ میں واقع ہوئی ہے اور یہ سورۃ مکی ہے جبکہ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی ولادت مدینہ میں ہوئی پھر قربیٰ میں یہ ہستیاں کیسے شامل ہوسکتی ہیں جبکہ یہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں؟

14. قرآن مجید کی روشنی میں ثابت کریں کہ مودّت اہل بیتؑ رسالت کا جز ہے؟

4

آیت درود

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَ یُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○

(سورۃ الاحزاب 33 آیت 56 پارہ 22)

ترجمہ: بے شک خدا اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ان پر درود بھیجو اور سر تسلیم خم کرو جیسے کرنے کا حق ہے۔

تفسیر

آنحضرتؐ پر درود :

ارشاد ہوتا ہے ''خدا اور فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رحمت اور درود بھیجتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں۔اب جبکہ ایسا ہے تو تم بھی اس وسیع پیغام سے ہم آہنگ ہو جاؤ۔ ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ان پر درود بھیجو اور انہیں سلام کرو اور ان کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرو۔''

وہ ہستی عالم خلقت کی ایک انمول گوہر ہے اور اگر خدا کی مہربانی سے تمہیں میسر ہے تو ایسا نہ ہو کہ تم انہیں ارزاں سمجھ لو۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی عظمت اور مقام کو فراموش کر دو۔وہ ایک ایسا عظیم انسان ہے جو تمھارے ہی درمیان کھڑا ہے لیکن وہ ایک عام انسان نہیں بلکہ ایسا انسان ہے کہ جس کا وجود پوری کائنات کا خلاصہ ہے۔

چند قابل توجہ نکات:

1. ''صلات'' کی جمع ''صلوات'' ہے اور جس وقت اس کلمہ کو خدا کی طرف نسبت دی جائے تو رحمت نازل کرنے اور رحمت بھیجنے کے معنی میں ہوگا اور جب اس کی نسبت فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو پھر طلب رحمت کے معنی میں ہوگا۔راغب نے المفردات

میں اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں پیش کیا ہے۔

تفسیر صافی میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے پس صلوات کا معنی ہے: قُوْلُوْا : اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

کہہ دیجیے: اے اللہ محمد وآل محمد علیہم السلام پر رحمت نازل فرما۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا ان کے لیے طلب رحمت کی دعا چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے۔ ہم کون ہیں ان کے لیے دعا کرنے والے اور خصوصاً مذکورہ صورت میں جبکہ آیت مجیدہ کا پہلا حصہ یہ ہے کہ اللہ ہماری دعا سے پہلے ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مسلسل باران رحمت برسانے کا اعلان فرما رہا ہے تو ان کے حق میں ہم سے طلبِ دعا کا مطالبہ کس لئے ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا ان کے لیے دعا کرنا محسن کے احسان کی حق شناسی کے طور پر ہے۔ اس دعا کا نتیجہ ہمارے ہی لیے ہے اور خدا ان کے طفیل اور وسیلہ سے ہم پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرماتا ہے۔

تفسیر برہان میں بروایت صفوان جمال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہر دعا آسمان تک جانے سے رکی رہتی ہے یعنی بارگاہ قبولیت تک نہیں پہنچتی جب تک درود شریف نہ پڑھا جائے۔

ایک اور روایت میں آپؑ نے فرمایا کہ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آئے زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھا کرو کیونکہ جو ایک دفعہ درود پڑھے خداوندِ کریم اور فرشتے اس پر ایک ہزار بار درود بھیجتے ہیں۔ خدا اور ملائکہ کے بعد خدا کی مخلوق میں سے کوئی شئے ایسی باقی نہیں رہتی جو ان پر درود نہ بھیجتی ہو اور جو شخص اس کے بعد بھی درود پڑھنے میں

بخل کرے تو وہ مغرور و جاہل ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام ایسے شخص سے بری و بیزار ہیں۔

2. ''یصلون'' کو فعل مضارع کی صورت میں لانا اس کے استمرار کی دلیل ہے۔ یعنی خدا اور فرشتے اس پر ہمیشہ رحمت اور درود بھیجتے رہتے ہیں۔

3. '' صَلُّوا اور سَلِّمُوْا '' کے درمیان کیا فرق ہے؟

مفسرین نے اس پر بہت بحث کی ہے لیکن جو کچھ ان دو الفاظ کے لغوی مفہوم اور قرآنی آیت کے ظاہری معنی سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ''صَلُّوْا'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طلبِ رحمت اور درود کا حکم ہے۔ رہا ''سَلِّمُوْا'' تو وہ یا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے احکام اور فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورہ نساء کی آیت 65 میں آیا ہے: **فَلاَ وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا** (پس اے رسولؐ) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم (نہ) بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح تنگدل بھی نہ ہوں بلکہ مطلق طور پر تسلیم کرلیں۔

نیز ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابوبصیر نے عرض کیا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنے کو تو میں سمجھ گیا ہوں لیکن اس تسلیم کا کیا معنی ہے؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: '' **هُوَ التَّسْلِیْمُ لَهٗ فِی الْاُمُوْرِ** '' ہر کام میں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا[1] یا پھر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر '' **اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ** ''

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں اور دوسری حدیث شیعہ اور سنی کتابوں میں متعدد طرق سے قریب قریب ایک جیسی عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

اور اس قسم کے کسی طریقے سے سلام بھیجنے کے معنی میں ہے جس کا مفہوم آنحضرتؐ کی بارگاہ خداوندی سے سلامتی کی درخواست کرنا ہے۔

ابو حمزہ ثمالی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کعب نامیؓ ایک صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں لیکن صلوات کس طرح بھیجنی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یوں کہا کرو: **اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ، وَبَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.**

اے اللہ درود بھیج محمدؐ وآل محمدؐ پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا ابراہیمؑ پر۔ بے شک تو حمید و مجید ہے اور اے اللہ برکتیں نازل فرما محمدؐ وآل محمدؐ پر جیسا کہ تو نے برکتیں نازل کیں ابراہیمؑ اور ان کی آل پر۔ بے شک تو حمید و مجید ہے۔

اس حدیث سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وصلوات کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے اور اسلام کا معنی بھی۔ [1]

اگر چہ سلام کے یہ دونوں معانی مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں ایک ہی نکتے کی طرف پلٹ رہے ہیں اور وہ ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور قولی اور عملی تسلیم۔ کیونکہ جو شخص ان پر سلام بھیجتا ہے اور خدا سے ان کی سلامتی طلب کرتا ہے تو درحقیقت وہ ان سے اپنے عشق اور محبت کا ثبوت دیتا ہے اور انہیں واجب الاطاعت پیغمبر کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔

[1] مجمع البیان میں انہی آیات کے ذیل میں یہ حدیث شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں متعدد طرق سے تقریباً ایک جیسی عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنے کی کیفیت کے سلسلے میں بے شمار شیعہ اور سنی روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "محمدؐ" پر صلوات بھیجتے وقت "آل محمدؐ" کا اضافہ بھی کر لو۔

درمنثور، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، ابن مردویہ اور دوسرے راویوں نے کعب بن عجرہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: **اَمَّا السَّلَامُ عَلَيْکَ فَقَدْ عَلَّمْنَا فَكَيْفَ الصَّلَاةُ عَلَيْکَ ؟** آپؐ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں لیکن فرمایئے آپؐ پر صلوٰت کیسے بھیجی جائے؟ تو آپؐ نے فرمایا یوں کہو: **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّکَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اَللّٰهُمَّ وَبَارِکْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّکَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ.**

اے اللہ درود بھیج محمدؐ و آل محمدؐ پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا ابراہیمؑ پر۔ بے شک تو حمید و مجید ہے اور اے اللہ برکتیں نازل فرما محمدؐ و آل محمدؐ پر جیسا کہ تو نے برکتیں نازل کیں ابراہیمؑ اور ان کی آل پر۔ بے شک تو حمید و مجید ہے۔

سیوطی (تفسیر درمنثور کے مؤلف) نے اس حدیث کے علاوہ اٹھارہ دوسری احادیث بھی نقل کی ہیں۔ جن میں تصریح ہوئی ہے کہ صلوات میں "آل محمدؐ" کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔

ان احادیث کو اہل سنت کی مشہور و معروف کتب اور صحابہؓ کی ایک جماعت سے نقل کیا گیا ہے جن میں ابن عباسؓ، طلحہؓ، ابوسعید خدریؓ، ابو ہریرہؓ، ابو مسعود انصاریؓ، بریدہؓ، ابن مسعودؓ، کعب بن عجرہؓ اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام شامل ہیں۔ [1]

برادرانِ اہل سنت کی مشہور حدیث کی کتاب صحیح بخاری میں اس بارے میں متعدد

[1] تفسیر درمنثور آیہ مذکورہ کے ذیل میں، تفسیر المیزان جلد 16 صفحہ 365۔ صفحہ 266 کے مطابق

احادیث نقل ہوئی ہیں۔[1] صحیح مسلم میں بھی اس سلسلے میں دو روایات آئی ہیں۔[2] تعجب کی بات ہے اس کتاب میں باوجود یہ کہ ان دو احادیث میں محمد و آل محمد علیہم السلام کا کئی بار تذکرہ ہوا ہے لیکن باب کا جو عنوان منتخب کیا گیا وہ بَابُ الصَّلٰوتِ عَلَی النَّبِیِّ ؐ ہے جبکہ آلؑ کا ذکر تک نہیں کیا گیا ہے۔

(پاکستان میں بھی ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، کتب، رسائل اور تقاریر میں خصوصاً بعض مولوی صاحبان جب آنحضرتؐ کا ذکر کرتے ہیں تو صلی اللہ علیہ وسلم ہی لکھتے اور بولتے ہیں ''آلہ'' ادا نہیں کرتے۔ تعجب ہے)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اہل سنت اور متعدد شیعہ روایات میں محمد اور آل محمد علیہم السلام کے درمیان لفظ ''علی'' کے ساتھ فاصلہ تک بھی نہیں ہے اور صلات کی کیفیت اس طرح ہے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ.

اس گفتگو کو ہم اسلام کے عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں ابن حجر مکی اپنی کتاب صواعق محرقہ میں نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''لَا تُصَلُّوْا عَلَی الصَّلَاۃِ الْبُتْرَاءِ فَقَالُوْا وَمَا الصَّلَاۃُ الْبُتْرَاءُ ؟ قَالَ تَقُوْلُوْنَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ تَمْسِكُوْنَ بَلْ قُوْلُوْا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ اٰلِ مُحَمَّدٍ .'' ''مجھ پر کبھی دم بریدہ (دُم کٹا ہوا) درود نہ بھیجا کرو۔'' اصحابؓ نے عرض کی: حضورؐ! وہ ناقص صلوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا: اگر فقط ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ'' کہو اس سے آگے نہ بڑھو اور رک جاؤ۔ بلکہ چاہیے کہ یوں کہا کرو:

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ''[3]

[1] صحیح بخاری جلد 6 صفحہ 151　[2] صحیح مسلم جلد 1 صفحہ 305 باب الصلاۃ علی النبی

[3] علامہ حلی کتاب تذکرہ کی بحث تشہد میں اس قول کو تمام علماء شیعہ کے علاوہ امام احمد بن حنبل اور بعض شافعیوں سے بھی نقل کرتے ہیں۔

انہیں روایات کی بناء پر اہل سنت کے بزرگ فقہا کی ایک جماعت حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ ''آل محمد علیہم السلام'' کے اضافہ کو نماز کے تشہد میں واجب سمجھتی ہے۔ [1]

آیا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو کہاں کہاں واجب ہے؟

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب فقہاء نے دیا ہے۔تمام فقہاء شیعہ اسے نماز میں پہلے اور دوسرے تشہد میں واجب سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ باقی تمام مقامات پر مستحب جانتے ہیں۔علاوہ ان احادیث کے جو اہل بیت علیہم السلام کے طرق سے اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں، کتب اہل سنت میں بھی وہ روایات کم نہیں جو وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔

ان میں سے ایک مشہور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔''سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ لَا يُقْبَلُ صَلَاةٌ اِلَّا بِطُهُوْرٍ وَّ بِالصَّلَاةِ عَلَيَّ'' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا انہوں نے فرمایا کہ نماز طہارت اور مجھ پر درود بھیجے بغیر قبول نہیں ہوگی۔

فقہاء اہل سنت میں سے امام شافعیؒ دوسرے تشہد میں صلوٰۃ پڑھنا واجب سمجھتے ہیں اور امام احمدؒ اور دوسرے کئی فقہا کے بارے میں دو طرح کی روایات نقل ہوئی ہیں۔البتہ امام ابوحنیفہؒ جیسے بعض افراد اسے واجب نہیں سمجھتے۔ [2]

حضرت امام شافعیؒ اس فتوے کو اپنے شعر میں نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

يَا اَهْلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَحَبُّكُمْ فَرَضٌ مِّنَ اللّٰهِ فِي الْقُرْاٰنِ اَنْزَلَهٗ
كَفَاكُمْ مِنْ عَظِيْمِ الْقَدْرِ اِنَّكُمْ مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلَاةَ لَهٗ

''اے اہل بیت رسول علیہم السلام تمہاری محبت خدا کی جانب سے قرآن میں

[1] صواعق محرقہ صفحہ 144 [2] تذکرہ علامہ حلیؒ جلد 1 صفحہ 126

واجب قرار دی گئی ہے۔تمہارے مقام کی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ جو شخص تم پر درود نہ بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔“ [1]

یہ بات ذہین نشین کر لینے کے قابل ہے کہ بعض اہل سنت حضرات آل محمدؐ کے ساتھ فضیلت وشرافت میں ظاہر کرنے کے لیے اصحابؓ وازواجؓ کو بھی درود کی عبارت میں شامل کرنے کی جسارت کرلیا کرتے ہیں چنانچہ وَعَلٰی اٰلِهٖ کے بعد وَعَلٰی اَصْحَابِهٖ وَعَلٰی اَزْوَاجِهٖ کا الحاق ہم نے کئی واعظوں اور خطیبوں سے سنا ہے۔

ہر ذی ہوش سمجھ سکتا ہے کہ ازواج رسولؐ اگر آل رسولؐ میں داخل ہوتیں تو وَعَلٰی اٰلِهٖ کے بعد وَعَلٰی اَزْوَاجِهٖ کا اضافہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔نماز کے تشہد میں صرف آل محمد علیہم السلام کو ہی شامل درود کیا جاتا ہے۔جس سے اس امر کی صاف نشان دہی ہوتی ہے کہ اصحابؓ وازواجؓ کو شامل درود کرنا منشائے خداوندی اور مرضی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہے اور اگر یہ اضافہ مبنی برحق ہوتا تو نماز کے تشہد میں حذف نہ کیا جاتا۔

[1] کتاب الغدیر میں ان اشعار کی نسبت امام شافعی کی طرف ”شرح المواہب زرقانی“ جلد 7 صفحہ 7 میں اور جماعت سے بھی نقل کی گئی ہے۔

خلاصہ

☆ ''صلات'' کی جمع ''صلوات'' ہے اور جس وقت اس کلمہ کو خدا کی طرف نسبت دی جائے تو رحمت نازل کرنے اور رحمت بھیجنے کے معنی میں ہوگا اور جب اس کی نسبت فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو پھر طلبِ رحمت کے معنی میں ہوگا۔

☆ تفسیر صافی میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے پس صلوات کا معنی ہے: **قولوا: " اللھم صلی علی محمد و آل محمد"**

☆ تفسیر برہان حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہر دعا آسمان تک جانے سے رکی رہتی ہے یعنی بارگاہ اجابت تک نہیں پہنچتی جب تک درود شریف نہ پڑھا جائے۔

☆ ''یصلون'' کو فعل مضارع کی صورت میں لانا اس کے استمرار (ہمیشہ ہونے) کی دلیل ہے۔ ''صَلُّوا'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طلبِ رحمت اور درود کا حکم ہے۔ رہا ''سَلِّمُوا'' تو وہ یا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورہ نساء کی آیت 65 میں آیا ہے۔

☆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنے کی کیفیت کے سلسلے میں بے شمار شیعہ اور سنی روایات میں وضاحت کے ساتھ آیا ہے کہ '' محمدؐ '' پر صلوات بھیجتے وقت

" آل محمدؐ " کا اضافہ بھی کرلو۔

بعض اہل سنت متعدد شیعہ روایات میں محمد اور آل محمد علیہم السلام کے درمیان لفظ "علی" کے ساتھ فاصلہ تک بھی نہیں ہے اور صلات کی کیفیت اس طرح ہے: " **اللھم صل علی محمد و آل محمد** "

☆ ابن حجر مکی اپنی کتاب صواعق محرقہ میں نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "مجھ پر کبھی دم بریدہ (دُم کٹی ہوئی یعنی ناقص) صلوٰت نہ بھیجا کرو۔" اصحابؓ نے عرض کی: حضورؐ! وہ ناقص صلوٰۃ کیا ہے؟ فرمایا: اگر فقط "**اللّٰھم صلّ علیٰ محمد** " کہو اس سے آگے نہ بڑھو اور رک جاؤ۔ بلکہ چاہیے کہ یوں کہا کرو "**اللّٰھم صل علیٰ محمد و الِ محمّد** "

☆ اہل سنت کے بزرگ فقہا کی ایک جماعت حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ "آل محمد علیہم السلام" کے اضافہ کو نماز کے تشہد میں واجب سمجھتی ہے۔

☆ بعض اہل سنت حضرات آل محمد علیہم السلام کے ساتھ فضیلت و شرافت میں ظاہر کرنے کے لیے اصحابؓ و ازواجؓ کو بھی درود کی عبارت میں شامل کرتے ہیں چنانچہ **وَعَلَی اٰلِہٖ** کے بعد **وَعَلٰی اَصْحَابِہٖ وَعَلٰی اَزْوَاجِہٖ** کا الحاق کرتے ہیں۔ تو واضح رہے کہ اگر یہ اضافہ درست ہوتا تو نماز کے تشہد میں حذف نہ کیا جاتا۔

خودآزمائی

1. آیت درود مع ترجمہ سنائیں؟

2. ”صلات“ کی نسبت اگر اللہ، فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو کیا معنی ہیں؟

3. حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے لیے ہم سے درود کا مطالبہ کس لئے ہے؟

4. تفسیر صافی میں ”صلواۃ“ کا کیا معنی ہے؟

5. کیا درود کے بغیر دعا قبول ہو سکتی ہے کتاب کا بھی حوالہ دیں؟

6. حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مطابق ایک دفعہ درود پڑھنے کا کتنا ثواب ہے؟

7. ”یصلون“ کو فعل مضارع کی صورت میں لانے سے کیا مراد ہے؟

8. ”صلوا“ اور ”سلموا“ کے درمیان کیا فرق ہے؟

9. کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر درود بھیجتے وقت آل محمد علیہم السلام کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کم از کم صحاح ستہ کی تین کتب کے حوالے بھی دیں؟

10. بعض اہل سنت اور متعدد شیعہ روایات میں محمد و آل محمد علیہم السلام کے درمیان لفظ ”علی“ کے ساتھ فاصلہ نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

11. دم بریدہ درود سے کیا مراد ہے اور مکمل درود کیا پڑھنا چاہیے کتاب کا حوالہ بھی دیں؟

12. فقہاء کے نزدیک نماز کے تشہد میں درود پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

13. حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اگر نماز میں اہل بیتؑ پر درود نہ بھیجا جائے تو کیا حکم ہے؟

14. بعض اہل سنت حضرات آل محمد علیہم السلام کے ساتھ فضیلت و شرافت میں ظاہر کرنے کے لیے اصحابؓ اور ازواجؓ کو بھی درود کی عبارت میں شامل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن خود ہی اپنے اس دعویٰ کی تردید کیسے کرتے ہیں؟

5

آیت خلافت

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ
خَلِیْفَةً ط قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ
الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ ط
قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ o وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ
کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَةِ لا فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قَالُوْا سُبْحَانَکَ
لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَاعَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ o
قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآ ئِهِمْ ج فَلَمَّآ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ لا
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ لا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ o

(سورۃ البقرہ 2 آیت 30 تا 33 پارہ 1)

ترجمہ:

جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا (پروردگار) کیا زمین میں ایسے شخص کو بنائے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا حالانکہ (اگر خلیفہ بنانا ہے تو ہمارا زیادہ حق ہے) کیونکہ ہم تیری تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں (اس پر پروردگارِ عالم نے) فرمایا: بے شک جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

پھر حضرت آدمؑ کو تمام اسماء سکھادیے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو بتاؤان کے نام کیا ہیں۔

فرشتوں نے کہا تو پاک ہے جو تو نے ہمیں تعلیم دی ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ تو حکیم ودانا ہے۔

فرمایا: اے آدمؑ ! انہیں ان (موجودات) کے ناموں (اور اسرار) سے آگاہ کردو۔ جب اس نے انہیں آگاہ کردیا تو خدا نے فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمان اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور تم جن چیزوں کو ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو انہیں بھی جانتا ہوں۔

تفسیر

ان آیات میں حضرت آدمؑ (پہلے انسان) کی خلقت کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پروردگارِ عالم کا فرشتوں کو زمین میں انسان کی خلافت و سرپرستی کے بارے میں خبر دینا اور وہ گفتگو جو فرشتوں نے اس سلسلے میں خدا سے کی۔

خدا کی خواہش یہ تھی کہ روئے زمین پر ایک ایسا **موجود** خلق فرمائے جو اس کا نمائندہ ہو۔ اس کی صفات صفاتِ خداوندی کا عکس ہوں اور اس کا مرتبہ و مقام فرشتوں سے بالاتر ہو۔ خدا کی خواہش اور ارادہ یہ تھا کہ ساری زمین اور اس کی نعمتیں، تمام قوتیں، سب خزانے، تمام کانیں اور سارے وسائل بھی اس کے سپرد کر دیے جائیں۔

ضروری ہے کہ ایسا شخص عقل و شعور، ادراک کے وافر حصے اور خصوصی استعداد کا حامل ہو۔ جس کی بنا پر موجوداتِ ارضی کی رہبری اور پیشوائی کا منصب سنبھال سکے۔ [1]

چند اہم نکات:

(i) خلافتِ الٰہیہ　　(ii) تعلیمِ اسماء

(iii) کیا مقامِ خلافت صرف حضرت آدمؑ کے لیے ہی مخصوص ہے یا یہ عظیم عہدہ آپؑ کی ذریّت میں ہمیشہ رہے گا؟

[1] تفسیر نمونہ جلد 1 صفحہ 152

خلافت الٰہی :

لفظ '' خلیفہ '' کامادہ خَلْفٌ و خَلَفَ ہے۔

خَلْفٌ (پیچھے) یہ قدام کی ضد ہے قرآن میں ہے: '' یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَاخَلْفَھُمْ '' (سورہ بقرہ آیت255) جو کچھ اس کے روبرو ہورہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔

خَلَفَ کے معنی پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔

خلافت کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو یا اس کے عجز کے سبب سے ہو یا محض نائب کو شرف بخشنے کی غرض سے ہو۔

اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے۔چنانچہ فرمایا: ''ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ''(سورہ انعام 6 آیت165) وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔ الخلائف کا واحد خلیفہ ہے قرآن میں ہے: ''یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ''(سورہ ص 38 آیت26) اے داوٗد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔[1]

گویا جب کوئی شخص کسی بلند مرتبہ ہستی کے کمالات اور صفات میں اس کی نمائندگی کرے اسے اس کا خلیفہ کہتے ہیں۔

ارشاد رب العزت ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں وَاِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ لہٰذا ''خلیفہ'' کے معنی ہیں جانشین۔

[1] مفردات القرآن، امام راغب اصفہانی جلد1 صفحہ312

یہاں اس سے مراد کس کا جانشین اور کس چیز میں جانشین؟

مفسرین نے اس کی مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض کہتے ہیں انسان یا اور موجودات یعنی جنات وغیرہ کا جانشین جو زمین میں پہلے زندگی گزارتے تھے۔ [1]

بعض کہتے ہیں کہ اس سے ملائکہ کی جانشینی مراد ہے جو اس سے پہلے زمین میں آباد تھے۔ [2]

بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ انسان کی دوسری نسلیں ایک دوسرے کی جانشین ہوں گی۔

لیکن انصاف یہ ہے جسے بہت سے محققین نے بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد خلافت الٰہی اور زمین میں خدا کی نمائندگی ہے۔ [3]

اسی طرح حضرت آدمؑ کو "اسماء" کی تعلیم دینا اس دعوے پر ایک اور واضح قرینہ ہے اور حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ بھی اسی مقصد کا شاہد ہے۔ بہر حال خدا چاہتا تھا کہ ایسے "وجود" کو پیدا کرے جو عالم وجود کا گلدستہ ہو اور خلافت الٰہی کے مقام کی اہلیت رکھتا ہو اور زمین میں اللہ کا نمائندہ ہو۔

ان آیات کی تفسیر میں ایک حدیث جو حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فرشتے مقام حضرت آدم علیہ السلام کو پہچاننے کے بعد سمجھ گئے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد زیادہ حقدار ہے کہ وہ زمین میں خلفاء

[1] الدر المنثور، سیوطی جلد 1 صفحہ 44 [2] الکشاف جلد 1 صفحہ 271 [3] تفسیر نمونہ جلد 1 صفحہ 152، المیزان جلد 1 صفحہ 115، الکشاف جلد 1 صفحہ 271، روح المعانی آلوسی جلد 1 صفحہ 220

الٰہی ہوں اور مخلوق پر اس کی حجت ہو۔[1]

زیر بحث آیت مزید بیان کرتی ہے کہ فرشتوں نے حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے نہ کہ اعتراض کی غرض سے عرض کیا: کیا زمین میں اسے (جانشین) قرار دے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا **قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ** ۔ جبکہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں، تیری تسبیح وحمد کرتے ہیں اور جس چیز کی تیری ذات لائق نہیں اس سے تجھے پاک سمجھتے ہیں **وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ**۔ مگر یہاں خدا نے انہیں مجمل (مختصر) جواب دیا جس کی وضاحت بعد کے مراحل میں کی گئی۔ فرمایا: میں ایسی چیزوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے **قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ**۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرشتوں نے کیسے گمان کرلیا کہ وہ انسان جسے اللہ سربراہی دینا چاہتا ہے وہ فساد کرے گا، خون بہائے گا اور خرابیاں کرے گا۔

بعض کہتے ہیں خدا نے انسان کے آئندہ کے حالات بطور اجمال (مختصراً) انہیں بتائے تھے۔

جبکہ بعض کا احتمال ہے کہ ملائکہ خود اس مطلب کو لفظ ''**فِى الْاَرْضِ**'' (زمین میں) سے سمجھ گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے انسان مٹی سے پیدا ہوگا اور مادہ اپنی محدودیت کی وجہ سے طبعاً (طبعیت کے لحاظ سے) مرکزِ نزع (مرکزِ فساد) ہے کیونکہ محدود مادی زمانہ انسانوں کی اس طبیعت کو سیر وسیراب نہیں کرسکتا جو زیادہ کی طلب رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ساری دنیا ایک فرد کو دے دی جائے تو ممکن ہے وہ پھر بھی سیر نہ ہو۔ اگر کافی احساس ذمہ داری نہ ہو تو یہ کیفیت فساد اور خونریزی کا سبب بنتی ہے۔

[1] معانی الاخبار بحوالہ المیزان جلد 1 صفحہ 121

بعض دوسرے مفسرین معتقد ہیں کہ فرشتوں کی پیشین گوئی اس وجہ سے تھی کہ حضرت آدمؑ روئے زمین کی پہلی مخلوق نہیں تھے بلکہ اس سے قبل بھی دیگر مخلوقات تھیں۔ جنہوں نے نزاع، جھگڑا اور خونریزی کی تھی۔ان سے پہلے کی مخلوق کا برا کردار نسل آدم کے بارے میں فرشتوں کی بدگمانی کا باعث بنا۔

یہ تین تفاسیر ایک دوسرے سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتیں یعنی ممکن ہے یہ تمام امور فرشتوں کی اس توجہ کا سبب بنے ہوں اور دراصل یہ ایک حقیقت بھی تھی جسے انہوں نے بیان کیا تھا یہی وجہ ہے کہ خدا نے جواب میں کہیں بھی اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ ایسی مزید حقیقتیں بیان کیں جو انسان اور اس کے مقام کے بارے میں موجود ہیں۔ جن سے فرشتے آگاہ نہیں تھے۔

فرشتے سمجھتے تھے اگر حضرت آدمؑ کی تخلیق کا مقصد عبودیت اور بندگی ہے تو ہم اس کے مصداقِ کامل ہیں۔ ہمیشہ عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں لہٰذا سب سے زیادہ ہم خلافت کے لائق ہیں۔لیکن وہ اس سے بے خبر تھے کہ ان کے وجود میں شہوت وغضب اور قسم قسم کی خواہشات موجود نہیں۔ جب کہ انسان کو میلانات وشہوات نے گھیر رکھا ہے اور شیطان ہر طرف سے اسے وسوسے ڈالتا رہتا ہے لہٰذا ان کی عبادت انسان کی عبادت سے بہت زیادہ تفاوت رکھتی ہے۔ کہاں اطاعت اور فرمانبرداری ایک طوفان زدہ کی اور کہاں عبادت اس ساحل نشینوں کی جو مطمئن، خالی ہاتھ اور سبک بار (ہمیشہ خوش رہنے والے) ہیں۔

انہیں کب معلوم تھا کہ اس آدمؑ کی نسل سے محمدؐ، ابراہیمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ جیسے انبیاءؑ اور آئمہ اہل بیتؑ جیسے امام اور ایسے صالح بندے اور جانباز شہید مرد اور عورتیں پیدا ہوں گے جو اپنے آپ کو راہِ خدا میں پیش کریں گے۔ ایسے افراد جن کے غور وفکر کی ایک گھڑی فرشتوں کی سالہا سال کی عبادت کے برابر ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ فرشتوں نے اپنی صفات کے بارے میں تین چیزوں کا سہارالیا: (i) تسبیح (ii) حمد (iii) تقدیس

اس میں شک نہیں کہ تسبیح اور حمد کے معنی خدا کو ہر قسم کے نقص سے پاک اور ہر قسم کے کمال کا اہل سمجھنا۔

بعض نے تقدیس کے معنی ''پروردگار کو ہر قسم کے نقصان سے پاک شمار کرنا'' بیان کئے ہیں جو کہ دراصل تسبیح کے معنی کی تاکید ہے۔

لیکن بعض معتقد ہیں کہ تقدیس مادہ ''قدس'' سے ہے جس کے معنی روئے زمین کو فاسد اور مفسد لوگوں سے پاک کرنا یا اپنے آپ کو ہر قسم کی بُری اور مذموم صفات سے پاک کرنا اور جسم و جان کو خدا کے لیے پاک کرنا۔ وہ لفظ ''لک ''کو جملہ ''نقدس لک''میں اس مقصود کے لئے شاہد قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ فرشتوں نے یہ نہیں کہا کہ '' نقدسک '' یعنی ہم تجھے پاک سمجھیں گے۔ بلکہ انہوں نے کہا ''نقدس لک'' یعنی تیرے لئے معاشرے کو پاک کریں گے۔

درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتے تھے:

اگر ہدف اور غرض اطاعت اور بندگی ہے تو ہم فرمانبردار ہیں۔

اگر ہدف اور غرض عبادت ہے تو ہم ہر وقت اس میں مشغول ہیں۔

اگر ہدف اور غرض اپنے آپ کو پاک رکھنا یا صفحۂ ارضی کو پاک رکھنا ہے تو ہم ایسا کریں گے جب کہ یہ مادی انسان خود بھی فاسد ہے اور روئے زمین کو فاسد کردے گا۔

حقائق کو تفصیل سے ان کے سامنے واضح کرنے کے لیے خداوند عالم نے ان کی آزمائش کے لیے اقدام کیا تا کہ وہ خود اعتراف کریں کہ ان کے اور اولادِ آدمؑ کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

تعلیم اسماء:

پروردگار کے لطف و کرم سے حضرت آدمؑ حقائقِ عالم کے ادراک کی کافی استعداد رکھتے تھے۔ خدا نے ان کی اس استعداد کو فضیلت کے درجے تک پہنچایا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق حضرت آدمؑ کو تمام اسماء (عالم وجود کے حقائق و اسرار) کی تعلیم دی وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔

مفسرین نے اگرچہ ''علم اسماء'' کی تفسیر میں قسم قسم کے بیانات دیے ہیں۔ اس آیتِ شریفہ میں ''اسماء'' سے مراد جب اللہ تعالی نے فرمایا:

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ

پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا تم مجھے ان کے اسماء بتاؤ

مذکورہ جملے میں وہ اسماء یا جن چیزوں کے وہ نام تھے وہ پردۂ غیب یعنی آسمانوں اور زمین میں زندہ اور باشعور موجود تھے اور بارگاہ ایزدی میں محفوظ تھے۔ اللہ تعالی نے انہی کی خیر و برکت سے ہر اسم کو نازل فرمایا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے ان کے نور اور حسن و جمال سے مشتق کیا ہے۔[1]

بعض مفسرین کے مطابق وہ اسماء جو اللہ نے حضرت آدمؑ کو تعلیم فرمائے۔ وہ اللہ کے اسمائے حسنہ اور مخلوقات کے نام تھے۔ بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے۔ بے شک ایک انسان جسے اللہ تعالی نے خلافت الٰہیہ کا عظیم منصب عطا فرمایا ہے۔ اسے ایک طرف تو اللہ کے اسمائے حسنہ اور اس کی صفاتِ جمال اور جلال کی مکمل معرفت ہونی چاہیے اور دوسری طرف اس کی مخلوقات کی مکمل پہچان تا کہ وہ اس کی طرف سے ان کے لیے کارہائے خدائی سرانجام دے سکے۔[2]

---

[1] المیزان جلد 1 صفحہ 115 تا 118: تلخیص (مشتق کا معنی پھاڑا گیا، بنایا گیا ہے) [2] اقتباس از: معارف قرآن صفحہ 365

بعض دوسری روایات میں ہے:

اسما به انوار تابناک و ارواح پاک معصومان علیهم السلام تفسیر گردیده زیرا آنان اسمای حسنای الهی اند [1]

''ان اسماء کی تفسیر معصومینؑ کے چمکنے والے انوار اوران کی پاک ارواح سے کی گئی ہے کیونکہ یہی نام اسماء حسنہ الٰہی ہیں۔''

تفسیر برہان میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے کہ خداوند کریم نے حضرت آدمؑ کو تمام انبیاء کے نام اور حضرت محمد مصطفیٰؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اوران کی ذریت طاہرہ اوران کے مخصوص شیعوں اور سرکش دشمنوں کے نام تعلیم فرمائے اور پھر عالم اشباح (عالم اجسام) میں چہاردہ معصومینؑ کے انوار کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو ان کے ناموں کی تفصیل وار خبر دو۔ پس ملائکہ نے عاجزی کا اظہار کیا اور کہا کہ **لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا**۔ یعنی ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے ہمیں تعلیم فرمایا اور بس اس کے بعد آدمؑ کو خدا نے حکم دیا کہ تم ان کو اُن یعنی انبیاءؑ وآئمہؑ کے ناموں کی خبر دے دو۔ پس جب حضرت آدمؑ نے نام بتلائے تو خدا نے ملائکہؑ سے انبیاء وآئمہؑ پر ایمان لانے اوران کو اپنے سے افضل ماننے کا عہد و پیمان لیا (یعنی ملائکہ نے تسلیم کرلیا کہ واقعی گروہِ انبیاء وآئمہؑ ان سے افضل و برتر ہیں) اور پھر ارشاد ہوا کہ کیا میں نے تم کو کہا نہیں تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے غیبوں کو جانتا ہوں اور میں اس چیز کو بھی جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور اس کو بھی جانتا ہوں جس کو تم پوشیدہ رکھتے ہو۔

لیکن مسلم ہے کہ آدمؑ کو کلمات واسماء کی تعلیم بغیر معانی کے نہیں دی گئی۔ کیونکہ یہ

[1] اصولِ کافی جلد 1 صفحہ 143

کوئی قابل فخر بات نہیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ اسماء کے معنی ومفاہیم اور جن چیزوں کے وہ نام تھے ان کی تعلیم ہو۔ البتہ جہانِ خلقت کے مختلف موجودات کے اسماء وخواص سے مربوط علم سے باخبر وآگاہ کیا جانا حضرت آدمؑ کے لیے بہت اعزاز تھا۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادقؑ سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا: اَلْاَرَضِیْنُ وَالْجِبَالُ وَالشِّعَابُ وَالْاَوْدِيَةُ ثُمَّ نَظَرَ اِلٰى بِسَاطِ تَحْتِهٖ فَقَالَ وَهٰذَا بِسَاطٌ مِمَّا عَلَّمَهٗ اسماء سے مراد زمینیں، پہاڑ، درے، وادیاں (غرض یہ کہ تمام موجودات) تھے۔ اس کے بعد امامؑ نے اس فرش کی طرف نگاہ کی جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا اور فرمایا یہاں تک کہ یہ فرش بھی ان امور میں سے ہے کہ خدا نے جن کی حضرت آدمؑ کو تعلیم دی۔[2]

اس سے ظاہر ہوا کہ علم اسماء علم لغت کے مشابہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق فلسفہ اسرار اور کیفیت وحواس کا نام تھا۔ خدا نے حضرت آدمؑ کو اس علم کی تعلیم دی تا کہ وہ اپنی سیر تکامل[3] میں اس جہاں کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہوسکیں۔ اس طرح چیزوں کے نام رکھنے کی استعداد بھی انہیں دی تا کہ وہ چیزوں کے نام رکھ سکیں اور ضرورت کے وقت ان کا نام لے کر انہیں بلاسکیں یا منگواسکیں۔ یہ ضروری نہ ہو کہ اس کے لیے ویسی چیز دکھانی پڑے۔

بہرحال ان اسماء سے مراد اور ان کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ان آیات سے دو بنیادی نقطے حاصل ہوتے ہیں:

1. اللہ تعالی نے حضرت آدمؑ کو مظہرِ انسانِ کامل اور فرشتوں کے استاد کے عنوان سے متعارف کروایا اور فرشتوں کو انسان کے شاگرد قرار دیا۔ اگر فرشتے خدا سے بغیر کسی

[1] تفسیر نمونہ جلد 1 صفحہ 157 [2] تفسیر مجمع البیان، زیر نظر آیات کے ضمن میں [3] ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے اس سفر کو اصطلاح میں سیر تکامل کہتے ہیں۔

واسطہ کے کسبِ علم کی استعداد و لیاقت رکھتے تو اللہ کی طرف سے ضرور سرفراز کیے جاتے۔

2. فرشتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ تمام اسماء کے حقائق کے عالم ہو سکیں۔ بلکہ وہ ایک حد تک ہی اسماء کے حقائق کی خبر رکھ سکتے تھے یہی وجہ تھی کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کو یہ نہیں فرمایا: "**علّمھم باسمائھم**" ان کو اسماء کی تعلیم دو بلکہ حضرت آدمؑ کو یوں فرمایا: "**انبئھم باسمائھم**" انہیں ان کے ناموں سے آگاہ کر دو۔

اس دلیل کی بنا پر خلافتِ الٰہیہ اور ملائکہ پر فضیلت اور بزرگی کے لیے حضرت آدمؑ کا انتخاب ان کی دریافت، تحمل حقائق اور بلند معارف کی وجہ سے تھا۔ حضرت آدمؑ میں تو یہ صلاحیت تھی لیکن ملائکہ یہ طاقت نہیں رکھتے تھے۔

تعلیمِ اسماء خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس موضوع کی اہمیت ہم اس وقت سمجھتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے کتاب اور لکھنے کی وجہ سے ہے اور گزرے ہوئے لوگوں کے سب علمی ذخائر ان کی تحریروں میں جمع ہیں اور یہ سب کچھ چیزوں کے نام رکھنے اور ان کے خواص کی وجہ سے ہے ورنہ کبھی بھی ممکن نہ تھا کہ ہم گزشتہ لوگوں کے علوم آنے والے لوگوں تک منتقل کر سکتے۔

پھر خداوند عالم نے فرشتوں سے فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو ان اشیاء اور موجودات کے نام بتاؤ جنہیں دیکھ رہے ہو اور ان کے اسرار و کیفیات کو بیان کرو **ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین** لیکن فرشتے جو اتنا علم نہ رکھتے تھے اس امتحان میں رہ گئے۔ لہٰذا جواب میں کہنے لگے خداوندا تو پاک ہے تو نے ہمیں جو تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے **قالوا سبحانک لا علم لنا الا ماعلمتنا** تو خود ہی علیم و حکیم ہے **انک انت العلیم الحکیم** اگر ہم نے اس سلسلے میں سوال کیا ہے تو یہ ہماری عدم آگاہی کی بنا پر تھا۔ ہم آدمؑ کی اس عجیب استعداد اور قدرت

سے بے خبر تھے جو ہمارے مقابلہ میں اس کا بہت بڑا امتیاز ہے۔ بے شک وہ تیری خلافت و جانشینی کی اہلیت رکھتا ہے جہانِ ہستی کی سرزمین اس کے وجود کے بغیر ناقص تھی۔

اب حضرت آدمؑ کی باری آئی کہ ملائکہ کے سامنے موجودات کا نام لیں اور ان کے اسرار بیان کریں۔ خداوند عالم نے فرمایا: اے آدمؑ فرشتوں کو ان موجودات کے ناموں اور کاموں سے آگاہ کرو **قال یادم انبئھم باسمائھم** جب حضرت آدمؑ نے انہیں ان اسماء سے آگاہ کیا تو خداوند نے فرمایا: کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں آسمان وزمین کے غیب سے واقف ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو سب سے باخبر ہوں **فلما انبا ھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموت والارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون**۔ اس مقام پر ملائکہ نے اس انسان کی وسیع معلومات اور حکمت ودانائی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلیا اور ان پر واضح ہوگیا کہ صرف یہی زمین پر خلافت کی اہلیت رکھتا ہے۔

جملہ "**ما کنتم تکتمون**" (جو کچھ تم چھپاتے ہو) اس بات کی نشان دہی ہے کہ فرشتوں نے جو کچھ ظاہر کیا تھا اس کے علاوہ کچھ دل میں بھی چھپائے ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ ابلیس کے غرور وتکبر کی طرف اشارہ ہے جو ان دنوں ملائکہ کی صف میں رہتا تھا۔ لہٰذا وہ بھی ساتھ ہی مخاطب تھا۔ اس نے دل میں یہ پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ حضرت آدمؑ کے سامنے نہیں جھکے گا۔

یہ احتمال بھی ہے فرشتے درحقیقت اپنے آپ کو روئے زمین پر خلافت الٰہی کے لیے ہر کسی سے زیادہ اہل سمجھتے تھے اگرچہ اس مطلب کی طرف اشارہ تو کرچکے تھے لیکن صراحت سے بیان نہ کیا تھا۔

خلافت الٰہیہ کا تا قیامت باقی رہنا:

مقامِ خلافت جو خدا کی طرف سے دیا گیا وہ حضرت آدمؑ کی ہی شخصیت سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حضرت آدمؑ کی خلقت سے اللہ تعالیٰ کا مقصد انسانوں کی خلقت ہے۔ جب تک اس دنیا میں انسان موجود رہیں گے خلیفۃ اللہ کا وجود ضروری ہے۔تا کہ وہ مخلوقِ خدا کے لیے خدائی کام سرانجام دے سکے۔اس کی صفات خدا کے جمال و جلال کا پرتو (عکس) ہوں اور وہ بالفعل یہ صلاحیت بھی رکھتا ہو کہ موجوداتِ ارضی کی رہبری اور پیشوائی کر سکے۔جب تک زمین میں اللہ کا خلیفہ ہوگا۔اللہ کا یہ ہدف باقی رہے گا اور اسی سے زندگی کے اجزاء باقی رہیں گے۔اگر خلیفۃ اللہ نہیں ہوگا تو فلسفۂ خلقت کی نفی ہو جائے گی اور نظام خلقت ختم ہو جائے گا اور روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلـنَّجُوْمُ اَمَانٌ لِاَ هْلِ السَّمَآءِ فَاِذَا ذَهَبَتِ النَّجُوْمُ ذَهَبَ اَهْلُ السَّمَآءِ وَاَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِاَ هْلِ الْاَرْضِ فَاِذَا ذَهَبَ اَهْلُ بَيْتِيْ ذَهَبَ اَهْلُ الْاَرْضِ.

"ستارے آسمان والوں کے لئے امان ہیں جب ستارے ختم ہوں گے تو آسمان والے بھی ختم ہو جائیں گے۔میرے اہل بیتؑ زمین والوں کے لئے امان ہیں۔جب میرے اہل بیتؑ چلے گئے تو زمین والے ختم ہو جائیں گے۔"[1]

اور یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت آدمؑ کی تمام اولاد کو مقام ولایت حاصل نہیں ہے جب فرشتے خلافت الٰہی کے مقام کے لائق نہیں ہیں تو کس طرح ایک فسادی، ظالم اور خون ریزی کرنے والا اس عہدہ کے قابل ہو سکتا ہے۔

وجود کی تخلیق کی اصلی غرض زمین میں خلافت الٰہی کا ہونا ہے اور ضروری ہے قیامت

[1] ذخائر العقبیٰ صفحہ 17

تک اور اس دنیا کے رہنے تک اس خلیفہ کا وجود قائم رہے اور ہر زمانے میں زمین اللہ کے خلیفہ اور اس کی حجت سے خالی نہ ہو۔ ورنہ غرض میں نقص آ جائے گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ خلیفہ کا تعین اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لوگ یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ اس میں مداخلت کریں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ خلیفہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک رابطہ معنوی (باطنی) ہو۔ اسی بنا پر خلیفہؑ پیغمبر درحقیقت خلیفہؑ خدا ہے۔ اسی طرح وہ فضائل و کمالات اور صفات کے اعتبار سے اس عظیم مرتبہ کے مستحق ہے۔ گویا امیر المومنینؑ اور آئمہ معصومینؑ اسماء اور صفات الٰہی کے مظہر ہیں۔ وہ مخزنِ علوم (علوم کے خزانے) اور مخزنِ اسرار (پوشیدہ رازوں کے خزانے) ہیں۔ وہ مکمل خلیفہ پیغمبرؐ ہونے کے مصداق ہیں۔ وہ درحقیقت زمین میں خلیفہ خدا ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبرؐ کے وسیلہ سے اس ممتاز مقام پر فائز ہوئے ہیں۔ [1]

دو سوال اس موقع پر باقی رہ جاتے ہیں:

1. خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو کس طرح ان علوم کی تعلیم دی تھی ؟

2. یہ عجیب مقابلہ ہے۔ حضرت آدمؑ کو خدا نے نام بتلا دیئے تھے۔ چنانچہ خود فرماتا ہے کہ اس کو اللہ نے نام بتلائے اور فرشتوں کو نہیں بتلائے تھے۔ اس مقابلہ میں فرشتوں نے خواہ مخواہ ہارنا ہی تھا۔ عدل خداوندی کا تقاضا یہی ہے کہ فریقین کو برابر تعلیم دے کر مقابلہ کرواتا حالانکہ ایسا نہیں ہوا؟

پہلے سوال کے جواب میں اس نقطے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ یہاں تعلیم جنبۂ تکوینی رکھتی ہے یعنی خدا نے یہ تعلیم حضرت آدمؑ کی طبیعت و سرشت (خمیر) میں قرار دی تھی اور تھوڑی ہی مدت میں اسے زیورِ تعلیم سے آراستہ کر دیا تھا۔

[1] اقتباس از: تفسیر المیزان جلد 1 صفحہ 115، تفسیر اثنا عشری، حسین شاہ عبدالعظیمی جلد 1 صفحہ 109

لفظ تعلیم کا اطلاق تعلیم تکوینی پر قرآن میں ایک اور جگہ پر بھی آیا ہے۔سورۃ رحمٰن آیت 4 ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ '' خدا نے انسان کو بیان کی تعلیم دی ہے۔

واضح رہے کہ یہ تعلیم خداوند عالم نے انسان کو مکتب خلقت میں دی ہے اور اس سے مراد وہی استعداد و خصوصیت فطری ہے جو انسان کے مزاج میں رکھ دی گئی ہے تاکہ وہ بات کر سکے۔

دوسرے سوال کے جواب میں اس طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ ملائکہ کی خلقت ایک خاص قسم کی ہے۔جس میں یہ تمام علوم حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہے۔وہ ایک اور مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔خلافت کے مقصد کے لیے ان کی تخلیق نہیں ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اس امتحان کے بعد حقیقت حال سمجھ گئے اور انہوں نے قبول کرلیا۔پہلے شاید وہ سوچتے تھے کہ اس مقصد کی اہلیت ان میں بھی ہے مگر خدا نے علم اسماء کے امتحان سے حضرت آدمؑ اور ان کی استعداد کا فرق واضح کر دیا۔

مثال کے طور پر اگر ایک استاد اپنے دو شاگردوں سے ان کی استعداد یا رجحان کے ماتحت ایک کو ایک فن کی تعلیم دے کر اس کی ڈیوٹی اسی فن کے تحت معین کر دے اور دوسرے کو کوئی دوسرا فن دے کر اس کو اسی نوعیت کی ڈیوٹی سپرد کرنا چاہے۔پہلا شاگرد اپنے فن کے بل بوتہ پر دوسری ڈیوٹی کے سنبھالنے کی خواہش کرے تو استاد اُسے اپنی غلطی تسلیم کرانے کے لئے دوسرے فن کے متعلق اس سے سوال کر کے اس کو خاموش کر دے تاکہ وہ خود بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ واقعی میری خواہش نادرست ہے اور میرا فن صرف میری اپنی ڈیوٹی کے لئے کار آمد ہے اور اس دوسری ڈیوٹی کے لئے وہی موزوں ہے جو اس کا صاحب فن ہے تو اس صورت میں پہلے شاگرد کو یہ کہنے کی مجال نہیں کہ مجھے وہ فن کیوں نہ سکھایا گیا۔پس اس میں نہ پہلے شاگرد سے ناانصافی لازم آتی ہے اور نہ استاد کی جانب داری کا سوال پیدا ہوتا ہے کیونکہ استاد اس مصلحت کو خود بہتر جانتا ہے۔

ہم ایک اور مثال سے واضح کرتے ہیں کہ اگر حکومت وقت ایک شخص کو کسی ملک کی سفارت کے لئے نامزد کر کے اس کو اسی عہدہ کے متعلق امور ضروریہ کی تعلیم دے کر دفتر سفارت کے کاغذات اس کے سپرد کر دے اور پھر دوسرے شخص کو عدلیہ کا محکمہ سپرد کرنے کے لئے اس کو اس نوعیت کی تعلیم دلوا کر عہدہ سپرد کرنا چاہے اور پھر سفیر اپنے علم سفارت کے پیش نظر عدلیہ کے عہدہ کی خواہش کرے اور بصورت ناکامی اپنی غلطی تسلیم کرے تو اُسے یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ مجھے پہلے سے وہ تعلیم کیوں نہ دلوائی گئی۔ پس اس میں نہ دل آزاری ہے اور نہ جانبداری۔

جب ظاہری دنیا کا یہ حال ہے کہ انتخاب کرنے والے کے طرز عمل کو مناسب مصلحت سمجھ کر ایک فن کا نااہل اپنی نااہلیت کا اعتراف کرلیا کرتا ہے اور یہ نہیں کہتا کہ مجھے اس فن کا اہل کیوں نہیں کہا گیا۔ چونکہ ملائکہ کو پیدا ہی تسبیح و تقدیس کے لئے کیا گیا تھا اور ان کی ڈیوٹی بھی وہی تھی اور حضرت آدمؑ کو پیدا ہی زمین کی خلافت کے لئے کیا گیا تھا لہٰذا علم خلافت ان کو عطا کیا گیا۔ اب اگر ملائکہ اپنی تسبیح و تقدیس کے بل بوتہ پر عہدۂ خلافت کے لئے بھی اپنا نام پیش کریں اور علومِ خلافت سے اپنے آپ کو نااہل پا کر اپنی درخواست واپس لے لیں اور اپنے کیے کی معافی مانگ لیں تو بعید از عقل ہر گز نہیں۔ اس میں ان پر ظلم کا سوال ہی نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت آدمؑ کی برتری مان لی اور سرِ تسلیم خم کرلیا اور سمجھ گئے کہ ہم جس عہدہ پر ہیں اسی کے اہل ہیں اور حضرت آدمؑ کو جو عہدہ دیا گیا ہے وہ اسی کے اہل ہیں۔

ممکن ہے یہ نام ملائکہ کو پہلے سے معلوم ہوں جس طرح کہ جناب رسالت مآبؐ اور اس کی آل طاہرینؑ کی خلقت نوری کی احادیث میں کثرت سے اس کا ذکر موجود ہے حتیٰ کہ ملائکہ نے تسبیح و تہلیل کا طریقہ بھی انہی کی تسبیح و تہلیل سے سیکھا تھا۔

عَنْ حَبِيْبِ ابْنِ مُظَاهِرِ الْاَسَدِیْ بَيَّضَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ اِنَّهٗ قَالَ لِلْحُسَيْنِ

بُنِ عَلِیِّ ابُنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِمَا السَّلَامُ اَیُّ شَیْیءٍ کُنْتُمْ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اٰدَمَ قَالَ کُنَّا اَشْبَاحَ نُوْرٍ نَدُوْرُ حَوْلَ الْعَرْشِ الرَّحْمٰنِ فَنُعَلِّمُ الْمَلَائِکَةَ التَّسْبِیْحَ وَالتَّهْلِیْلَ وَالتَّمْجِیْدَ.

''حبیب ابن مظاہرؓ سے روایت ہے خدا ان کے چہرے کو روشن کرے انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں درخواست کی کہ مولا حضرت آدمؑ کی خلقت سے پہلے آپؑ کیا تھے فرمایا: ہم نور کے پرتو (عکس، شعاع) تھے جو عرش رحمٰن کے اردگرد طواف کرتے تھے ہم نے فرشتوں کو تسبیح و تہلیل اور تمجید سکھائی۔'' ۱؎

مُحَمَّدُ بْنُ عَبَّاسٍ الخ عَنِ الرَّبِیْعِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْهَاشِمِیُّ عَنْ اَشْیَاخٍ مِّنْ اٰلِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَلِیَّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالُوْا قَالَ عَلِیٌّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِیْ بَعْضِ خُطَبِهٖ اَنَا اٰلُ مُحَمَّدٍ کُنَّا اَنْوَارَ اَحْوَالِ الْعَرْشِ فَاَمَرَنَا اللّٰهُ بِالتَّسْبِیْحِ فَسَبَّحْنَا فَسَبَّحَتِ الْمَلَائِکَةُ بِتَسْبِیْحِنَا ثُمَّ اَهْبَطَنَا اِلَی الْاَرْضِ فَاَمَرَنَا اللّٰهُ بِالتَّسْبِیْحِ فَسَبَّحْنَا فَسَبَّحَتْ اَهْلُ الْاَرْضِ بِتَسْبِیْحِنَا فَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ''آل محمدؐ کے بزرگ کہتے ہیں کہ ایک خطبے میں حضرت علیؑ نے فرمایا: ہم آل محمدؐ عرش کے اردگرد نور کی حالت میں تھے۔ خدا نے ہمیں تسبیح کرنے کا حکم دیا پس ہم نے تسبیح کی اور ہماری تسبیح کی وجہ سے ملائکہ نے تسبیح کی۔ پھر زمین پر آئے پھر خدا نے ہمیں تسبیح کا حکم دیا پس ہم نے تسبیح کی اور ہماری وجہ سے زمین والوں نے تسبیح کی اور قرآن مجید میں جن لوگوں کو صافون (صف باندھنے والے) اور مسبحون (اللہ کی تسبیح کرنے والے) کہا گیا ہے وہ ہم لوگ ہیں۔'' ۲؎

حضرت آدمؑ چونکہ نو وارد تھے اس لئے ان کو اب اسماء تعلیم کئے گئے۔ نام تو ہر دو کو

۱؎ صدوق، ابن بابویہ، علل الشرائع صفحہ 23 ۲؎ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار جلد 24 صفحہ 88

معلوم ہو گئے۔ اب ان ناموں والے جب عالمِ انوار میں ملائکہ کے سامنے پیش ہوئے تو ملائکہ کو اگرچہ نام تو معلوم تھے لیکن ہر نام کی نام والے کے ساتھ مطابقت نہ کر سکے کہ یہ فلاں ہے اور یہ فلاں۔ جب حضرت آدمؑ سے سوال ہوا تو انہوں نے ہر ایک نام کو اپنے مسمّٰے پر منطبق کر دیا۔ ملائکہ چونکہ مجردات سے ہیں لہٰذا ان میں علم اسی حد تک محدود رہتا ہے جتنا ان کو تعلیم کیا جائے اور مادہ بشریہ اور قوائے بدنیہ کا یہ خاصہ ہے کہ عقل ان کی معیت میں اپنی تحصیل میں ترقی کر سکتی ہے۔ پس حضرت آدمؑ نے علائم و خصوصیات کے پیش نظر اپنے غور و فکر سے ہر صاحب نام کا ملائکہ سے تعارف کرایا اور ملائکہ نے بھی اپنی معذرت میں خود اس چیز کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: **" قالوا سبحاناک لا علم لنا الا ما علمتنا"** انہوں نے کہا تیری ذات پاک ہے۔ ہمیں تو صرف اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے ہمیں تعلیم فرمایا یعنی اس کے آگے قدم ہم نہیں رکھ سکتے۔

یہ نہیں کہا کہ تو نے ہمیں بتایا نہیں بلکہ بتایا تو ہے لیکن جتنا بتایا ہے ہم اسے دہرا سکتے ہیں۔ اس سے آگے نہیں چل سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ تعلیم مساوی تھی۔ لیکن اس سے ترقی کرنا خاصہٴ بشریت تھا۔ جس سے فرشتے عاجز تھے اور فرشتوں نے اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ نتیجے حاصل کئے :

(i) خدا کا حضرت آدمؑ کو خلافت ارضیہ کے لئے نامزد فرمانا عین مصلحت ہے جس سے ہم غافل تھے لہٰذا اپنے بے جا سوال پر اللہ سے توبہ کی جو قبول ہوئی۔

(ii) ان کے دلوں میں جو یہ گھمنڈ تھا کہ ہم عابد و تسبیح گزار ہیں اور اسی پر اترا کر یہ خیال کر لیا کہ ہم تمام مخلوقات سے افضل ہیں وہ ختم ہو گیا اور سمجھ لیا کہ ہم سب سے افضل وہ مخلوق ہے جو خلافتِ ارضیہ کے لئے نامزد کی گئی ہے۔

(iii) یہ بھی سمجھ لیا کہ خلافتِ الٰہیہ کا معیار صرف تسبیح و تقدیس نہیں بلکہ اس کے

ساتھ ساتھ کافی استعداد علمیہ کی ضرورت ہے۔

(iv) ان کی نظر جو صرف بنی آدمؑ کے فسادات وخون ریزیوں پر مرکوز تھی جس کی بنا پر وہ ان کو خلافت ارضیہ کے لئے ناموزوں سمجھتے تھے اب ان کے فضائل و کمالات کا پہلو بھی ان کے سامنے آ گیا۔

(v) حضرت آدمؑ کا علمی کمال دیکھ کر اس کا استحقاقِ خلافت تسلیم کرلیا اور بحکم خدا ان کو ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

(vi) ابلیس جو مدتوں ملائکہ کے ساتھ شریکِ عبادت رہا۔ اس سرکشی سے اس کا خبث باطن بھی ان کو معلوم ہو گیا اور سمجھ گئے کہ نوریوں کی صحبت میں بھی ناری ناری ہوا کرتا ہے اور بوقت امتحان اہل کمال کے سامنے جھک جانے سے قربِ بارگاہ نصیب ہوتا ہے اور جو اس مقام پر نکتہ چینی یا تکبر کرے وہ راندہ بارگاہ ہو کر مستحق لعنت ہو جایا کرتا ہے۔

(vii) ملائکہ کی نظر بنی آدمؑ کے فسادی افراد پر تھی۔ جو یقیناً عہدۂ خلافت کے لئے ان فٹ تھے۔ لیکن جب عالم انوار میں حضرت آدمؑ کی پشت سے ہونے والے حقیقی خلفاء سے تعارف ہوا تو ان کے سامنے اپنے سر جھکا لیے اور ان کی موالات ومحبت کا عہد خدا سے کرلیا اور مان لیا کہ واقعی یہ لوگ زمین کی خلافت کے زیادہ حقدار ہیں۔

یہ سوال کہ اگر مقصود علم اسماء، علمِ اسرار خلقت اور تمام موجودات کے خواص جاننا تھا تو پھر ضمیر "ھم" لفظ "اسمائھم" اور لفظ "ھولاء" کیوں استعمال ہوئے جو عموماً افراد عاقل کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ضمیر "ھم" اور لفظ "ھولاء" صرف عاقل کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات عاقل اور غیر عاقل کے مجموعے پر یہاں تک کہ افراد غیر عاقل کے لیے بھی بولے جاتے ہیں جیسے حضرت یوسفؑ ستاروں، سورج اور چاند کے بارے میں کہتے ہیں " رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ " میں نے خواب میں دیکھا کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ (سورۃ یوسف 12 آیت 4)

خلاصہ

☆ خدا کی خواہش یہ تھی کہ روئے زمین پر ایک ایسا **موجود** خلق فرمائے جو اس کا نمائندہ ہو۔ اس کی صفات صفاتِ خداوندی کا عکس ہوں اور اس کا مرتبہ ومقام فرشتوں سے بالاتر ہو۔ ساری زمین اور اس کی نعمتیں، تمام قوتیں، سب خزانے، تمام کانیں اور سارے وسائل بھی اس کے سپرد کر دیے جائیں۔ ضروری ہے کہ ایسا شخص عقل وشعور اور خصوصی استعداد کا حامل ہو۔ جس کی بنا پر موجوداتِ ارضی کی رہبری اور پیشوائی کا منصب سنبھال سکے۔

خلافت الٰہی :

لفظ ''خلیفہ'' کا مادہ خَلْفٌ وخَلَفَ ہے۔ خَلَفَ کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ خلافت کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی بلند مرتبہ ہستی کے کمالات اور صفات میں اس کی نمائندگی کرے اسے اس کا خلیفہ (جانشین) کہتے ہیں۔

اللہ کے حضرت آدمؑ کو زمین پر جانشین بنانے کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء :

(i) انسان یا اور موجودات یعنی جنات وغیرہ کا جانشین۔

(ii) ملائکہ کی جانشینی۔

(iii) انسان کی دوسری نسلیں ایک دوسرے کی جانشین۔

(iv) لیکن انصاف یہ ہے جسے بہت سے محققین نے بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد خلافتِ الٰہی اور زمین میں خدا کی نمائندگی ہے۔

☆ فرشتوں نے کیسے گمان کرلیا کہ انسان فساد کرے گا، خون بہائے گا اور خرابیاں کرے گا۔اس میں مفسرین نے کئی احتمالات بیان کیے ہیں:

(i) خدانے انسان کے آئندہ کے حالات بطورِ اجمال (مختصر) انہیں بتائے تھے۔

(ii) ملائکہ خود اس مطلب کو لفظ "فی الارض" سے سمجھ گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے انسان مٹی سے پیدا ہوگا اور مادہ اپنی محدودیت کی وجہ سے طبعاً مرکز نزع ہے۔

(iii) فرشتوں کی پیشین گوئی اس وجہ سے تھی کہ حضرت آدمؑ روئے زمین کی پہلی مخلوق نہیں تھے بلکہ اس سے قبل بھی دیگر مخلوقات تھیں۔جنہوں نے نزاع، جھگڑا اور خونریزی کی تھی۔

یہ تین تفاسیر ایک دوسرے سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتیں یعنی ممکن ہے یہ تمام امور فرشتوں کی اس توجہ کا سبب بنے ہوں۔

فرشتے سمجھتے تھے اگر حضرت آدمؑ کی تخلیق کا مقصد عبودیت اور بندگی ہے تو سب سے زیادہ ہم خلافت کے لائق ہیں۔یہ بات قابل توجہ ہے کہ فرشتوں نے اپنی صفات کے بارے میں تین چیزوں کا سہارا لیا: (i) تسبیح (ii) حمد (iii) تقدیس

تعلیم اسماء:

قرآن کے مطابق حضرت آدمؑ کو تمام اسماء (عالم وجود کے حقائق واسرار) کی تعلیم دی۔مفسرین نے اگرچہ "علم اسماء" کی تفسیر میں قسم قسم کے بیانات دیے ہیں:

(i) وہ اسماء پردۂ غیب یعنی آسمانوں اور زمین میں زندہ اور باشعور موجود تھے اور

بارگاہ ایزدی میں محفوظ تھے۔ اللہ تعالی نے انہی کی خیر و برکت سے ہر اسم کو نازل فرمایا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے ان کے نور اور حسن و جمال سے مشتق کیا ہے۔

(ii) اللہ کے اسمائے حسنہ اور مخلوقات کے نام۔

(iii) تمام انبیاء، چہاردہ معصومینؑ اوان کی ذریت طاہرہ اوران کے مخصوص شیعوں اور دشمنوں کے نام تعلیم فرمائے اور پھر عالم اشباح میں چہاردہ معصومینؑ کے انوار کو ملائکہ پر پیش کیا۔

جہانِ خلقت کے مختلف موجودات کے اسماء و خواص سے مربوط علم سے حضرت آدمؑ کو آگاہ کیا گیا۔ علم اسماء علم لغت کے مشابہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق فلسفہ اسرار اور کیفیت وخواص کا نام تھا۔ خداوندِ عالم نے حضرت آدمؑ کو اس علم کی تعلیم دی تا کہ وہ اپنی سیر تکامل میں اس جہاں کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔ اس طرح چیزوں کے نام رکھنے کی استعداد بھی انہیں دی تا کہ وہ چیزوں کے نام رکھ سکیں۔

بہر حال ان اسماء سے مراد اور ان کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ان آیات سے دو بنیادی نقطے حاصل ہوتے ہیں:

(i) اللہ تعالی نے حضرت آدمؑ کو مظہرِ انسانِ کامل اور فرشتوں کے استاد کے عنوان سے متعارف کروایا۔ اگر فرشتے خدا سے بغیر کسی واسطہ کے کسبِ علم کی استعداد و لیاقت رکھتے تو اللہ کی طرف سے ضرور سرفراز کیے جاتے۔

(ii) فرشتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ تمام اسماء کے حقائق کے عالم ہوسکیں۔ بلکہ وہ ایک حد تک ہی اسماء کے حقائق کی خبر رکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کو یہ نہیں فرمایا "**علمهم باسمائهم**" ان کو اسماء کی تعلیم دو بلکہ

حضرت آدمؑ کو یوں فرمایا: " انبئھم باسمائھم " انہیں ان کے ناموں سے آگاہ کر دو۔

اس دلیل کی بناپر خلافتِ الٰہیہ اور ملائکہ پر فضیلت کے لیے حضرت آدمؑ کا انتخاب ان کے تحمل حقائق اور بلند معارف کی وجہ سے تھا۔ حضرت آدمؑ میں تو یہ صلاحیت تھی لیکن ملائکہ یہ طاقت نہیں رکھتے تھے۔

جملہ "ما کنتم تکتمون" جو کچھ تم چھپاتے ہو۔اس بات کی نشان دہی ہے کہ فرشتوں نے جو کچھ ظاہر کیا تھا اس کے علاوہ کچھ دل میں بھی چھپائے ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ ابلیس کے غرور و تکبر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ احتمال بھی ہے فرشتے درحقیقت اپنے آپ کو روئے زمین پر خلافت الٰہی کے لیے ہر کسی سے زیادہ اہل سمجھتے تھے۔

خلافت الٰہیہ کا قیامت تک باقی رہنا:

مقامِ خلافت جو خدا کی طرف سے دیا گیا وہ حضرت آدمؑ کی ہی شخصیت سے مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ حضرت آدمؑ کی خلقت سے اللہ تعالیٰ کا مقصد انسانوں کی خلقت ہے۔ جب تک اس دنیا میں انسان موجود رہیں گے۔ خلیفۃ اللہ کا وجود ضروری ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضرت آدمؑ کی تمام اولاد کو مقام ولایت حاصل نہیں ہے۔ خلیفہ کا تعین اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لوگ یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ اس میں مداخلت کریں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ خلیفہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک رابطہ معنوی ہو۔ اسی بناپر خلیفۂ پیغمبر درحقیقت خلیفۂ خدا ہے۔ اسی طرح وہ فضائل و کمالات اور صفات کے اعتبار سے اس عظیم مرتبہ کے مستحق ہیں۔ گویا امیر المومنینؑ اور آئمہ معصومینؑ اسماء صفات الٰہی کے مظہر ہیں۔ وہ مخزنِ علوم اور غیبی اسرار کا خزانہ ہیں۔ وہ مکمل خلیفہ پیغمبرؐ ہونے کے مصداق

ہیں۔ وہ درحقیقت زمین میں خلیفہ خدا ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبرؐ کے وسیلہ سے اس ممتاز مقام پر فائز ہوئے ہیں۔

اگر مان لیا جائے کہ حضرت آدمؑ کو اسرارِ خلقت اور تمام موجودات کے خواص کا علم دیا گیا تو قرآن میں ھم اور ھؤلاء کے الفاظ کیوں استعمال ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ عموماً افراد عاقل کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے بلکہ بعض اوقات یہ الفاظ عاقل اور غیر عاقل کے مجموعے پر یہاں تک کہ افراد غیر عاقل کے لیے بھی بولے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ستاروں، سورج اور چاند کے لیے افرادِ عاقل کی ضمیر ھم استعمال ہوئی ہے۔

سوال: خداوندہ عالم نے حضرت آدمؑ کو کس طرح ان علوم کی تعلیم دی تھی؟

جواب: یہاں تعلیم جنبۂ تکوینی رکھتی ہے یعنی خدا نے یہ تعلیم حضرت آدمؑ کی طبیعت و سرشت میں قرار دی۔ اس سے مراد استعداد و خصوصیت فطری ہے جو تھوڑی ہی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ لفظ تعلیم کا اطلاق تعلیم تکوینی پر قرآن میں ایک اور جگہ پر بھی آیا ہے سورۃ رحمٰن ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' خدا نے انسان کو بیان کی تعلیم دی ہے۔

سوال: عجیب مقابلہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو خدا نے نام بتا دیئے اور فرشتوں کو نہیں بتائے کیا یہ بات عدل خدا کے خلاف نہیں ہے؟

جواب: ملائکہ کی خلقت تسبیح و تقدیس کے لئے ہوئی۔ جبکہ حضرت آدمؑ کو پیدا ہی زمین کی خلافت کے لئے کیا گیا تھا لہٰذا علم خلافت ان کو عطا کیا گیا۔ اب اگر ملائکہ اپنی تسبیح و تقدیس کے بل بوتہ پر عہدۂ خلافت کے لئے بھی اپنا نام پیش کریں اور علومِ خلافت سے اپنے آپ کو

نااہل پا کر اپنی درخواست واپس لے لیں تو اس میں نہ کوئی ظلم ہے نہ زیادتی۔

ممکن ہے یہ نام ملائکہ کو پہلے سے معلوم ہوں کیونکہ ملائکہ نے تسبیح و تہلیل کا طریقہ آل محمدؑ سے سیکھا تھا۔ حضرت آدمؑ چونکہ نو وارد تھے اس لئے ان کو اب اسماء تعلیم کئے گئے۔ نام تو ہر دو کو معلوم ہو گئے۔ اب ان ناموں والے جب عالمِ انوار میں ملائکہ کے سامنے پیش ہوئے۔ ملائکہ کو اگرچہ نام تو معلوم تھے لیکن ہر نام کی نام والے کے ساتھ مطابقت نہ کر سکے جب حضرت آدمؑ سے سوال ہوا تو انہوں نے ہر ایک نام کو اپنے مسمّٰے پر منطبق کر دیا۔

ملائکہ چونکہ مجردات سے ہیں۔ لہٰذا ان میں علم اسی حد تک محدود رہتا ہے جتنا کہ ان کو تعلیم کیا جائے اور مادہ بشریہ اور قوائے بدنیہ کا یہ خاصہ ہے کہ عقل ان کی معیت میں اپنی تحصیل میں ترقی کر سکتی ہے۔ پس حضرت آدمؑ نے علائم و خصوصیات کے پیش نظر اپنے غور و فکر سے ہر صاحب نام کا ملائکہ سے تعارف کرایا اور ملائکہ نے اپنی معذرت میں خود اس چیز کا اظہار کیا ہے: ''ہمیں تو صرف اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے ہمیں تعلیم فرمایا'' یہ نہیں کہا کہ تو نے ہمیں بتایا نہیں بلکہ بتایا تو ہے لیکن جتنا بتایا ہے ہم اسے دہرا سکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ تعلیم مساوی تھی۔ لیکن اس سے ترقی کرنا خاصۂ بشریت تھا۔ جس سے فرشتے عاجز تھے۔

خود آزمائی

1. حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا مقصد بیان کریں؟
2. قرآن مجید کی روشنی میں لفظ ''خلیفہ'' کی وضاحت کریں؟
3. اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کس کا خلیفہ قرار دیا اس سلسلے میں مفسرین کی آراء بیان کریں آپ کے خیال میں کون سی تفسیر مناسب ہے؟
4. حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کے مطابق خلافت الٰہیہ کی حقدار کون سی ہستیاں ہیں؟
5. فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت پر حقیقت کو نہ جاننے کی غرض سے اعتراض کیا یا وہ واقعی حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت پر معترض تھے۔ وضاحت کریں؟
6. فرشتوں نے کیسے گمان کر لیا کہ وہ انسان جسے اللہ سربراہی دینا چاہتا ہے وہ فساد کرے گا، خون بہائے گا اور خرابیاں کرے گا؟
7. کیا فرشتے زمین پر خلافت کے خود بھی امیدوار تھے؟
8. درج ذیل الفاظ کی وضاحت کریں؟

(i) تسبیح (ii) حمد (iii) تقدیس

9. اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جن اسماء کی تعلیم دی وہ کیا تھے؟

10. مقام خلافت جو خدا کی طرف سے دیا گیا وہ حضرت آدم علیہ السلام کی ہی شخصیت سے مخصوص تھا یا جب تک اس دنیا میں انسان موجود رہیں گے خلیفۃ اللہ کا وجود ضروری ہے وضاحت کریں؟

11. خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو کس طرح ان علوم کی تعلیم دی تھی؟

12. کیا یہ عجیب مقابلہ نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نام بتا دیئے اور فرشتوں کو نہیں بتائے اس سے اللہ کے عدل پر زد نہیں آتی؟

13. جب فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی برتری واضح ہو گئی تو اس مرحلے پر پہنچ کر انہوں نے کیا نتائج حاصل کیے؟

14. اگر یہ بات مان لی جائے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام موجودات کے خواص ان کے نام اور اسرار کا علم دے دیا تو پھر قرآن میں ضمیر "هم" لفظ "اسمائهم" اور لفظ "هولاء" کیوں استعمال ہوئے جو عموماً افراد عاقل کے لئے استعمال ہوتے ہیں؟

6

آیت امامت

وَاِذِابْتَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط
قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط قَالَ وَمِنْ
ذُرِّیَّتِیْ ط قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ○

(سورۃ البقرۃ 2 آیت 124 پارہ 1)

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو ان کے ربّ نے چند کلمات سے آزمایا تو انہوں نے انہیں پورا کر دیا تو خدا نے فرمایا کہ میں تمہیں سب انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے عرض کی اور میری اولاد میں سے۔ خدا نے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہ پہنچے گا۔

تفسیر

اس آیت میں خدا فرماتا ہے وہ وقت یاد کرو جب خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مختلف طریقوں سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں میں اچھی طرح کامیاب ہوئے **وَاِذِابْتَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ**۔ یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے اہم ترین موڑ یعنی ان کی بڑی بڑی آزمائشوں اور ان میں ان کی کامیابی کے متعلق گفتگو کرتی ہے۔ وہ آزمائشیں جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت، مقام اور شخصیت کو مکمل طور پر نکھار دیا اور ان کی شخصیت کی بلندی کو روشن کر دیا۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان امتحانات سے کامیاب ہو گئے تو وہ منزل آئی کہ خدا نے انہیں انعام دیتے ہوئے فرمایا: میں نے تمہیں لوگوں کا امام، رہبر اور پیشوا قرار دیا **قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** حضرت ابراہیم علیہ السلام نے درخواست کی۔ میری اولاد اور خاندان سے بھی آئمہؑ قرار دے تاکہ عہدۂ نبوت و امامت منقطع نہ ہو اور صرف ایک شخص کے ساتھ قائم نہ رہے۔ **قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ** خدا نے اس کے جواب میں فرمایا میرا عہد یعنی مقام امامت ظالموں تک ہرگز نہیں پہنچے گا **قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ** یعنی ہم نے تمہاری درخواست قبول کر لی ہے لیکن تمہاری ذریت میں صرف وہ لوگ اس مقام کے لائق ہیں جو پاک اور معصوم ہیں۔

چند اہم نکات:

اس آیت میں چند ایسے اہم موضوعات ہیں جن کے بارے میں گہری نظر سے تحقیق کی ضرورت ہے:

(1) کلمات کا معنی۔

(2) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات۔

(3) کیا امامت سے مراد نبوت ہے۔

(4) امامت کا معنی۔

(5) نبوت، رسالت اور امامت میں فرق۔

(6) عہدۂ امامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری سیر تکامل۔

(7) ظلم کا معنی۔

(8) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت سے مراد۔

(9) امام کا تعین خدا کی طرف سے۔

(1) ''کلمات'' سے کیا مراد ہے:

آیاتِ قرآن اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہ اعمال جن کی خدا نے تعریف کی ہے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلمات (وہ جملے جو خدا نے ابراہیمؑ کو سکھائے) دراصل ذمہ داریوں کا ایک بھاری اور مشکل سلسلہ تھا جو خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذمے لگایا اور اس مخلص پیغمبرؐ نے انہیں بہترین طریقے سے انجام دیا۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عہدہ امامت عطا کرنے سے پہلے اس لیے آزمانا چاہتے تھے اگر وہ آزمائش میں پورا اترتے تو انہیں عہدہ امامت دے دیا جاتا۔ ورنہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے حالات، صفات اور صلاحیتوں کو نہیں جانتے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ عقیدہ علم الٰہی میں جہل (جہالت) اور ناآگاہی پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔

یہ واضح رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش سے اللہ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی استعداد، قابلیت اور صلاحیت کو ظاہر کیا جائے اور ان کے مقامات عالی اور ولایت کے کمالات معنوی (باطنی) کو اجاگر کیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اس آزمائش میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مقام امامت عطا کیا اور انہوں نے اس پر فخر کیا۔

جب ان کا درجہ بلند ہو گیا تو انہوں نے خواہش کی کہ یہ مقام میری اولاد کو بھی عطا کیا جائے۔ لیکن خدا نے اس درخواست کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا اور کہا: یہ مقام صاحبِ لیاقت لوگوں کو ملے گا جو ظلم و ستم میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

(2) حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات:

(i) اپنی بیوی اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں لے جانا جہاں کوئی انسان نہ بستا تھا۔

(ii) بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانا اور فرمانِ خدا سے اسے قربان کرنے کے لیے پرعزم آمادگی کا مظاہرہ کرنا۔

(iii) بابل کے بت پرستوں کے مقابلے میں قیام کرنا، بتوں کو توڑنا اور اس تاریخی مقدمے میں پیش ہونا اور نتیجۃً آگ میں پھینکا جانا اور ان تمام مراحل میں اطمینان و ایمان کا ثبوت دینا۔

(iv) بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا اور اپنی زندگی کے سرمائے کو ٹھوکر

مارنا اور دیگر علاقوں میں جا کر پیغام حق سنانا۔

ایسے اور بھی بہت سے امور ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک بہت سخت اور مشکل آزمائش تھی ۔لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام قوت ایمانی کے ذریعے ان تمام میں پورا اُترے اور ثابت کیا کہ وہ مقامِ امامت کی اہلیت رکھتے تھے۔

(3) کیا امامت سے مراد نبوت ہے؟

محل بحث آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو مقام امامت بخشا گیا اس سے مراد مقام نبوت نہیں ہے۔

لیکن بعض مفسرین اہل سنت جیسا کہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر جلد 4 صفحہ 39، آلوسی تفسیر روح المعانی جلد 2 صفحہ 375 وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں مقام امامت سے مراد مقام نبوت ہی ہے۔

ہم یہاں چند دلائل سے واضح کرتے ہیں کہ امامت نبوت سے بالاتر مقام ہے:

(i) اس آیت میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ جس وقت آپ نے اس مقام کے عطا ہونے کی بشارت سنی تو آپ نے فخر کیا۔ آپ کی اولاد بھی تھی۔ اگر آپ کا کوئی بیٹا نہ ہوتا یا آپ بڑھاپے میں ہوتے اور بیٹے کی امید بھی نہ ہوتی تو پھر آپ اپنی اولاد کے لیے اس عہدے کا تقاضا نہ کرتے۔

اگر آپؑ جوانی میں تھے اور آپؑ کو بیٹے کی امید بھی تھی ۔ ادب نبوت کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ہونے والی اولاد کے لیے اس مقام کا تقاضا کرتے اور پروردگار سے بیٹے کے ہونے کی شرط کا اظہار کرتے مثلاً وہ کہتے: ومن ذریتی ان رزقتنی ذریة اگر تو نے مجھے اولاد عطا کی تو وہ مقام ان کو بھی عطا کر۔ جب کہ آپ نے

بطور مطلق اور بغیر کسی شرط اور قید کے یہ مقام اپنی اولاد کے لیے بھی طلب کیا تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی آپ نبی تھے اور آپ کی اولاد بھی موجود تھی۔

(ii) امتحانات کے بعد آپکو عہدۂ امامت دیا گیا جس پر آپ نے فخر کیا۔ آپ کے یہ تمام امتحانات پیغمبری کے زمانے میں تھے۔

(iii) کلمہ " اماما " مفعول دوئم ہے اور اسکا عامل کلمہ "جاعلٌ" ہے۔ اسم فاعل اگر گزشتہ کے معنی میں ہو تو وہ عمل نہیں کرتا نہ ہی مفعول رکھتا ہے۔ وہ اس وقت عمل کرتا ہے جب وہ حال یا آئندہ کے معانی میں ہو اسی بنا پر یہ جملہ: "انی جاعلک للناس اماما" حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بشارت ہے کہ اسے حال یا مستقبل میں امام قرار دینے والا ہوں۔ خود یہ جملہ اور یہ بشارت اسے وحی کے ذریعے سے پہنچی۔

پس معلوم ہوا اس سے پہلے جب انہیں بشارت دی گئی وہ پیغمبر تھے اور انہیں یہ وحی کی گئی۔ لہٰذا امامت نبوت کے علاوہ عہدہ ہے جو انہیں دیا گیا۔

(4) امامت سے مراد :

مقامِ امامت مقامِ نبوت و رسالت سے بالاتر مقام ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے امامت کے مختلف معانی بیان کیے جاتے ہیں۔

(i) امامت کا معانی ہے صرف دنیاوی امور میں لوگوں کی قیادت و پیشوائی۔

(جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں)

(ii) امامت کا معانی ہے امور دین و دنیا میں پیشوائی۔

(اہل سنت میں ہی بعض اس کے قائل ہیں)

(iii) امامت کا معانی دینی پروگراموں کا ثابت ہونا جس میں حدود احکام الٰہی

کے اجراء کے لیے حکومت کا وسیع مفہوم شامل ہے اس طرح ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے نفوس کی تربیت و پرورش بھی امامت کے مفہوم میں داخل ہے۔ (تفسیر نمونہ)

تیسرے معانی کے لحاظ سے یہ مقام رسالت و نبوت سے بلند تر ہے کیونکہ نبوت و رسالت خدا کی طرف سے خبر دینا اس کا فرمان پہنچانا اور خوشخبری دینا اور تنبیہ کرنا ہے۔ لیکن منصب امامت میں ان امور کے ساتھ ساتھ اجرائے احکام اور نفوس کی ظاہری و باطنی تربیت بھی شامل ہے (البتہ واضح رہے کہ بہت سے پیغمبر مقام امامت پر بھی فائز تھے)

درحقیقت مقام امامت دینی منصوبوں کو عملی شکل دینے کا نام ہے۔ یعنی "ایصالٌ الی المطلوب" (مقصود تک پہنچنا)

اجرائے قوانین کے لحاظ سے اور تکوینی ہدایت کے اعتبار سے (یعنی تاثیر باطنی اور نفوذ روحانی کے اعتبار سے) یہ وہ شعاعِ نور ہے جو انسانی دلوں کو روشنی بخشتی ہے اور انہیں ہدایت کرتی ہے۔ اس لحاظ سے امام بالکل آفتاب کی طرح ہے جو اپنی شعاعوں سے سبزہ زاروں کی پرورش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے اور اس کے ملائکہ رحمت بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکال کے لے جائے اور مومنین پر مہربان ہے۔ (سورۃ الاحزاب 33 آیت 43)

یہ بات امام پر صادق آتی ہے۔ امام اور مقام امامت کے حامل عظیم پیغمبر مستعد و آمادہ افراد کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں جہالت اور گمراہی سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زیر بحث آیت میں امامت کے مذکورہ تیسرے مفہوم ہی کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ قرآن کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامت کے مفہوم میں

ہدایت بھی شامل ہے۔جیسا کہ سورۃ سجدہ 32 آیت 24 میں ہے: **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ.** ہم نے انہیں امام بنایا تا کہ ہمارے فرمان کے مطابق ہدایت کریں اس لیے کہ وہ صبر و استقامت رکھتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔

یہ ہدایت " **اِرَائَةُ الطَّرِيْقِ** " (راستہ دکھانا) کے معنی والی نہیں ہے۔کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مرحلہ امامت سے پہلے مقام نبوت و رسالت اور " ارائۃ الطریق " کے مفہوم کی ہدایت کے منصب پر تو یقیناً فائز تھے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو منصب امامت سخت آزمائشوں سے گزرنے اور یقین، شجاعت اور استقامت کے مراحل طے کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا وہ بشارت، ابلاغ اور اِنذار (نصیحت) کے معانی کے علاوہ مقام ہدایت کا حامل ہے۔ لہٰذا وہ ہدایت جو امامت کے مفہوم میں داخل ہے "**اِيْصَالٌ اِلَى الْمَطْلُوْبِ**" روحِ مذہب کو عملی شکل دینا اور آمادہ نفوس کی تربیت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔(تفسیر نمونہ)

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ عَبْدًا قَبْلَ اَنْ يَّتَّخِذَهُ نَبِيًّا وَاِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَهُ نَبِيًّا قَبْلَ اَنْ يَّتَّخِذَهُ رَسُوْلًا وَاِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَهُ رَسُوْلًا قَبْلَ اَنْ يَّتَّخِذَهُ خَلِيْلًا وَاِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَهُ خَلِيْلاً قَبْلَ اَنْ يَّتَّخِذَهُ اِمَامًا فَلَمَّا جَمَعَ الْاَشْيَاءَ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا فَمِنْ عُظْمِهَا فِيْ عَيْنِ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِ ى الظّٰلِمِيْنَ قَالَ لَا يَكُوْنُ السَّفِيْهُ اِمَامَ التَّقِّيْ.

خداوند عالم نے نبی بنانے سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عبد قرار دیا اور اللہ نے انہیں رسول بنانے سے پہلے نبی قرار دیا اور انہیں خلیل بنانے سے قبل اپنی رسالت کے

لیے منتخب کیا اور اس سے پہلے کہ امام بناتا انہیں اپنا خلیل بنایا جب یہ تمام مقامات ومناصب انہیں حاصل ہو چکے تو اللہ نے فرمایا: میں تمہیں انسانوں کے لیے امام بناتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام عظیم دیا تو انہوں نے عرض کیا: خدایا! میری اولاد سے بھی امام قرار دے۔ ارشاد ہوا میرا عہد ظالموں تک نہ پہنچے گا۔ بے وقوف شخص متقی لوگوں کا امام نہیں ہوسکتا۔ [1]

(5) نبوت، رسالت اور امامت میں فرق:

آیات میں موجود ارشادات اور احادیث میں وارد ہونے والی مختلف تعبیرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے معمور لوگ مختلف منصبوں پر فائز تھے۔

مقام نبوت: خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنا۔ لہٰذا نبی وہ ہے جس پر وحی نازل ہو اور جو کچھ وحی کے ذریعے معلوم ہو لوگ چاہیں تو انہیں بتادیں۔

مقام رسالت: مقام ابلاغ وحی، تبلیغ ونشر احکام الٰہی اور تعلیم وآگہی سے نفوس کی تربیت۔ لہٰذا رسول وہ ہے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی معموریت کے خطے میں جستجو اور کوشش کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے اور لوگوں تک اس کا فرمان پہنچائے۔

مقام امامت: رہبری، پیشوائی اور امور مخلوق کی باگ دوڑ سنبھالنا۔ درحقیقت امام وہ ہے جو حکومت الٰہی کی تشکیل کے لیے ضروری توانائیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ احکام خدا کو عملاً جاری اور نافذ کرسکے اور اگر فی الوقت باقاعدہ حکومت کی تشکیل ممکن نہ ہو تو جس قدر ہوسکے اجرائے احکام کی کوشش کرے۔

[1] اصول کافی جلد اول باب طبقات الانبیا والرسل والائمہ صفحہ 133

دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہیں گے۔امام کا کام اور ذمہ داری احکام وقوانین الٰہی کا اجراء ہے جبکہ رسول کی ذمہ داری احکام الٰہی کا ابلاغ ہے۔

اس مفہوم کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں:

رسول کا کام ''اِرَائَۃُ الطَّرِیْقِ'' راستے کا دیکھانا ہے۔

امام کی ذمہ داری ''ایصال الی المطلوب'' مطلوب تک پہنچنا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ رسولِؐ اسلام کی طرح بہت سے پیغمبرؑ تینوں عہدوں پر فائز تھے ۔وحی وصول کرتے، فرامین خداوندی کی تبلیغ کرتے، نیز تشکیل حکومت اور اجرائے احکام کی کوشش کرتے اور باطنی طور پر بھی نفوس کی تربیت کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ امامت ہر جہت سے مقام رہبری کا نام ہے: وہ مادی ہو یا معنوی جسمانی ہو یا روحانی اور ظاہری ہو یا باطنی ۔امام حکومت کا سربراہ ،لوگوں کا پیشوا، مذہبی رہنما، اخلاق کا مربی اور باطنی ہدایت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اپنی مخفی اور معنوی قوت سے امام اہل افراد کو سیر تکامل کے لیے باطنی رہبری کرتا ہے۔اپنی علمی قدرت کے ذریعے نادان و جاہل افراد کو تعلیم دیتا ہے اور اپنی حکومت کی طاقت سے یا دیگر اجرائی طاقتوں سے اصول عدالت کا اجراء کرتا ہے۔ (تفسیر نمونہ)

(6) عہدۂ امامت حضرت ابراہیمؑ کی آخری سیر تکامل[1]:

امامت کی حقیقت کے بارے میں ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخصیت مقام تبلیغ و رسالت کی حامل ہو لیکن منصب امامت پر فائز نہ ہو۔ کیوں کہ اس منصب کے لیے ہر پہلو سے بہت زیادہ اہلیت ولیاقت کی ضرورت ہے اور یہ وہ مقام ہے جسے ابراہیم علیہ السلام تمام امتحانات کے بعد حاصل کر سکے۔اس سے ضمناً یہ بھی

[1] سیر تکامل: ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے اس سفر کو اصطلاح میں سیر تکامل کہتے ہیں۔

واضح ہوتا ہے کہ امامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے سیر تکامل کی آخری منزل تھی۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ امامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا خود سے اہل اور نمونہ ہونا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلماً آغاز نبوت سے ایسے ہی تھے۔

جو سمجھتے ہیں کہ امامت کا مقصد دوسرے کے لیے نمونہ اور ماڈل ہونا ہے تو یہ صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ میں ابتدائے نبوت سے موجود ہوتی ہے۔ اسی لیے تو سب کہتے ہیں کہ پیغمبر کو معصوم ہونا چاہیے کیونکہ اس کے اعمال اور کردار دوسروں کے لیے نمونہ قرار پاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مقام امامت ان چیزوں سے کہیں بلند ہے یہاں تک کہ نبوت و رسالت سے بھی بالاتر ہے اور یہ وہ مقام و منصب ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اس کی اہلیت کا امتحان دینے کے بعد بارگاہ الٰہی سے حاصل کیا۔

زیر بحث آیت کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جو ہماری بات پر شاہد ہیں:

(i) وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورہ انبیاء 21 آیت 73)

اور ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔

(ii) وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (سورہ سجدہ 32 آیت 24)

جب انہوں نے استقامت دکھائی تو ہم نے انہیں امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔

پہلی آیت جو بعض انبیاءؑ و مرسلینؑ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور دوسری جس میں بنی اسرائیل کے کچھ انبیاءؑ کا ذکر ہے نشاندہی کرتی ہیں کہ امامت کا تعلق ہمیشہ سے ایک خاص قسم کی ہدایت سے رہا ہے جو فرمان خدا کے مطابق ہے۔

(7) ظلم کسے کہتے ہیں؟

" لا ینال عھدی الظالمین " میں جس ظلم کا ذکر ہے وہ فقط دوسروں پر ظلم ڈھانا نہیں بلکہ یہاں ظلم کا تذکرہ عدل کے مقابلے میں ہے۔ یہاں یہ لفظ اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عدالت کا حقیقی معنی ہے "ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا۔" اس بنا پر ظلم کا مفہوم یہ ہوگا: "کسی شخص یا چیز کو ایسے مقام پر رکھنا جس کے لیے وہ اہل نہیں ہے۔"

ذمہ داری اور عظمت کے لحاظ سے امامت اور مخلوق کی ظاہری و باطنی رہبری ایک بہت بڑا مقام ہے۔ ایک لحہ کا گناہ اور نافرمانی بلکہ سابقہ غلطی بھی اس مقام کی اہلیت چھن جانے کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی احادیث میں حضرت علی علیہ السلام کے لیے رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ بلافصل ہونے کے ثبوت میں محل بحث آیت سے استدلال کیا گیا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ دوسرے لوگ تو زمانۂ جاہلیت میں بت پرست تھے مگر وہ شخص جس نے آن واحد کے لئے بھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا وہ صرف حضرت علی علیہ السلام تھے۔ مثلاً:

(i) ہشام بن سالم امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں آپؑ نے فرمایا:

قَدْ کَانَ اِبْرَاھِیْمَ نَبِیًّا وَ لَیْسَ بِاِمَامٍ حَتّٰی قَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًافَقَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِ ی الظّٰلِمِیْنَ مَنْ عَبَدَ صَنَمًا اَوْوَثَنًا لَا یَکُوْنَ اِمَامًا.

"منصب امامت پر فائز ہونے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پیغمبر تھے یہاں تک کہ خدا نے فرمایا: میں تجھے انسانوں کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے کہا: میری اولاد میں سے بھی امام قرار دے۔ فرمایا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا جنہوں نے بتوں کی پرستش کی ہے وہ امام نہیں ہوسکتے۔" (اصول کافی جلد 1 باب طبقات الانبیا والرسل)

(ii) ایک اور حدیث عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے پیغمبرؐ اکرم سے منقول ہے آپؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا:

لَا اُعْطِیْکَ عَهْدًا لِلظَّالِمِ مِنْ ذُرِّیَّتِکَ قَالَ یَا رَبِّ مَنِ الظَّالِمُ مِنْ وَلَدِیَ الَّذِیْ لَا یَنَالُ عَهْدُکَ قَالَ مَنْ سَجَدَ لِصَنَمٍ مِنْ دُوْنِیْ لَا اَجْعَلُهٗ اِمَامًا اَبَدًا وَلَا یُصْلِحُ اَنْ یَّکُوْنَ اِمَامًا.

''میں امامت کا عہدہ تیری اولاد میں سے ظالموں کو نہیں بخشوں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا وہ ظالم جن تک یہ منصب نہیں پہنچ سکتا، کون ہیں؟ خدا نے فرمایا: وہ شخص ظالم ہے جس نے بت کو سجدہ کیا ہو۔ میں ایسے کو ہرگز امام نہیں بناؤں گا اور نہ ہی وہ امام بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔''[1]

سابقہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ اس آیت میں کلمہ ظالمین سے مراد وہ شخص ہے کہ جس سے کسی قسم کا بھی ظلم سرزد ہو۔ یہ بات عام ہے کہ وہ ظلم چھوٹا ہو یا بڑا یا یہ ظلم شرک یا کفر کی قسم میں سے ہو یا کوئی اور گناہ ہو۔ نیز وہ عمر کے ابتدائی حصے میں سرزد ہو یا عمر کے آخری حصے میں اگرچہ اس نے توبہ کر لی ہو۔

ایک ایسا گروہ جو اپنی تمام عمر میں کسی بھی ظلم اور گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور وہ ہر طرح سے معصوم ہوتا ہے اس آیت کے مطابق وہ امامت کے لائق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا صرف ایسے افراد اور ان کی اولاد کے لئے مستجاب (قبول) ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی شخص بھی مکمل طور پر اس کے اعمال سے آگاہ نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ ہی امام کا انتخاب کرتا ہے۔

[1] امالی از شیخ مفید و مناقب ابن معازلی

(8) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت سے مراد:

(i) قرآن مجید کے فرمان کے مطابق امامت ایمانِ کامل اور مقامِ یقین کی منزل تک رسائی کا نام ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْن اور انہیں میں سے ہم نے کچھ لوگوں کو امام بنایا چونکہ انہوں نے (مصیبتوں پر) صبر کیا تھا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے تھے اور ہماری آیتوں کا دل سے یقین رکھتے تھے۔ (سورہ سجدہ 32 آیت 24)

علامہ طباطبائی کے مطابق: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے عالم ملکوت[1] ظاہر کردیے گئے۔ نتیجۂ مقام ولایت کے حاصل ہوتے ہی آپ یقین کی منزل پر بھی فائز ہوئے۔'' (المیزان جلد 1 صفحہ 373)

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو سارے آسمان اور زمین کے ملکوت کا انتظام دکھاتے رہے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں۔ (سورۃ الانعام 6 آیت 75)

یہ بات واضح ہے کہ امام بغیر کسی وسیلہ کے اللہ سے ہدایت حاصل کرتا ہے یعنی حصولِ ہدایت کے لیے اللہ اور امام کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ پوری زندگی ظلم اور گناہ سے دور رہتا ہے: اَفَمَنْ يَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ''جو شخص دین کی راہ دیکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حق دار ہے کہ اس کے حکم کی پیروی کی جائے یا وہ شخص جو دوسرے کی ہدایت تو درکنار خود جب تک دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے دیکھ نہیں پاتا تو تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو''۔ [2]

اس آیت سے یہ واضح ہے کہ ہادی دو قسم کے ہیں:

[1] عالم ملکوت سے مراد پروردگاری، عالم ملائکہ، عالم ارواح، عالم غیب ہے [2] سورہ یونس 10 آیت 35

ایک ہادی وہ ہے جو لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلاتا ہے۔ اپنی ہدایت کے لیے غیروں کا محتاج نہیں بلکہ اللہ تعالی کی طرف سے بلاواسطہ (Direct) ہدایت پاتا ہے۔

دوسرا ہادی وہ ہے جو لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلاتا ہے۔ مگر اپنی ہدایت کے لیے غیروں کا محتاج ہے۔

(ii) امامت ہدایت کی ہی ایک قسم ہے جو نبوت اور رسالت سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا" اور ہم نے انہیں (حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو) آئمہ قرار دیا جو ہمارے امر سے ہدایت کرتے ہیں۔ (سورہ انبیاء 21 آیت 73)

اس آیت کے ضمن میں ہدایت بہ امر کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں: ہدایت جو منصب امامت ہے یہ نفوس میں تصرف تکوینی کی ایک قسم کا نام ہے۔ اس تصرف کے ذریعے دلوں کو کمال کے راستے کی طرف لے جانا ہے اور ایک عام مقام سے مقام بالا تک منتقل کرنا ہے۔ پس ضروری ہے یہ ہدایت امر تکوینی کی صورت ہو نہ کہ تشریعی۔

"ہدایت بہ امر" فیض معنوی اور مقامات باطنی میں سے ہے کہ مومنین عمل صالح کے ذریعے اس ہدایت یعنی ہدایت بہ امر تک پہنچتے ہیں اور پروردگار کی رحمت کو پا لیتے ہیں چونکہ امام صاحب امر ہوتا ہے اور وہ اس امر سے ہدایت کرتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امام ہر کسی سے پہلے خود ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور امام کے ذریعے ہی ہدایت تمام لوگوں تک پہنچتی ہے۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امام لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ظاہری اور باطنی فیض حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

چونکہ پیغمبرؐ خدا اور لوگوں کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے اور پیغمبر فیوضات ظاہری (شریعتِ الٰہی) وحی کے ذریعے خدا سے لیتا ہے اور اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔
نیز ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امام ایک ایسی حجت ہے جو بلند مقامات کی طرف نفوس کی رہنمائی کرتا ہے جس طرح پیغمبر لوگوں کو اعتقاد حق اور اعمال صالح کی طرف رہنمائی کرتا ہے البتہ اولیاء اللہ میں سے بعض صرف پیغمبر ہیں اور بعض صرف امام اور بعض دونوں مقامات رکھتے ہیں جیسے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے دونوں بیٹے۔ (المیزان جلد 14 صفحہ 429)

(9) امام کا تعین خدا کی طرف سے:

زیر بحث آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام (ہر لحاظ سے لوگوں کے رہبر کے مفہوم کے اعتبار سے) خدا کی طرف سے معین ہونا چاہیے۔ کیونکہ امامت ایک قسم کا خدائی عہد و پیمان ہے اور واضح ہے کہ جسے خدا معین کرے گا۔ اس پیمان کے ایک طرف خود خدا ہوگا۔
یہ بھی ظاہر ہوا کہ جن لوگوں کے ہاتھ ظلم و ستم سے رنگے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی میں کہیں ظلم کا نشان موجود ہے۔ چاہے اپنے اوپر ہی ظلم کیوں نہ ہو یہاں تک کہ ایک لحظہ کے لئے بت پرستی کی ہو وہ امامت کی اہلیت نہیں رکھتے۔
اصطلاح میں کہتے ہیں کہ امام کو اپنی تمام زندگی میں معصوم ہونا چاہیے۔

کیا خدا کے سوا کوئی صفت عصمت سے آگاہ ہو سکتا ہے؟

اگر اس معیار پر جانشین پیغمبر کا تعین کیا جائے تو حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ تعجب کی بات ہے کہ المنار کے مؤلف نے بھی حضرت ابو حنیفہؒ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق ان کا اعتقاد تھا کہ خلافت منحصراً اولادِ علیؑ کے شایان شان ہے۔

اسی بنا پر وہ حاکم وقت (منصور عباسی) کے خلاف مظاہرات کو جائز سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے خلفائے بنی عباس کی حکومت میں انہوں نے منصب قضاوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

دو سوالات جو وضاحت طلب ہیں:

(i) امامت کے مفہوم کی وضاحت میں جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امام کا کام **ایصال الی المطلوب** اور الٰہی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہے پھر اس مفہوم نے بہت سے انبیاء یہاں تک کہ سرکار رسالتؐ اور آئمہ طاہرینؑ کے ہاتھوں عملی شکل تو اختیار نہیں کی بلکہ ان کے مقابلے میں ہمیشہ گنہگار اور گمراہ لوگ برسرِ اقتدار رہے؟

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ امام مجبور کر کے لوگوں کو حق تک پہنچاتا ہے۔ بلکہ اپنے اختیار، آمادگی اور اہلیت سے لوگ امام کے ظاہری و باطنی کمالات سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ آفتاب زندہ موجودات کی نشو و نما کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا یہ کہ بارش کا کام مردہ زمینوں کو زندہ کرنا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ یہ تاثیر عمومی پہلو رکھتی ہے لیکن صرف ان موجودات کے لئے جو یہ اثرات قبول کرنے کے لئے آمادہ اور نشو و نما حاصل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(ii) دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تفسیرِ امامت کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر امام پہلے نبی اور رسول ہو۔ اس کے بعد مقام امامت پر فائز ہو جبکہ رسالت مآبؐ کے معصومؑ جانشین تو ایسے نہ تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ امام پہلے نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہو بلکہ اگر امام سے پہلے کوئی شخصیت نبوت، رسالت اور امامت تمام مناصب کی حامل

ہو (جیسا کہ پیغمبرؐ تھے) تو اس کا جانشین منصبِ امامت میں اس کی ذمہ داریوں کی انجام دہی جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ جب نئی رسالت کی ضرورت نہ ہو جیسا کہ پیغمبرؐ اسلام کے بعد کیونکہ وہ خاتم الانبیاءؑ ہیں۔

دوسرے الفاظ میں وحی الٰہی کے نزول کا مرحلہ اور تمام احکام کا ابلاغ انجام کو پہنچ چکا ہو اور صرف نفاذ کی منزل باقی ہو تو جانشین پیغمبر اجرائے احکام کا کام جاری رکھ سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں کہ خود نبی یا رسول ہو۔

خلاصہ

یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی آزمائشوں اور کامیابیوں کے متعلق گفتگو کرتی ہے۔ کامیابی پر خدا نے انہیں لوگوں کا امام، رہبر اور پیشوا قرار دیا۔

چند اہم نکات

(1) کلمات:

وہ جملے ہیں جو خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے۔ آزمائش سے اللہ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی استعداد، قابلیت اور صلاحیت کو ظاہر کیا جائے اور ان کے مقامات عالی اور ولایت کے کمالات معنوی (باطنی) کو اجاگر کیا جائے۔

(2) حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات:

(i) اپنی بیوی اور بیٹے کو مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں لے جانا۔

(ii) بیٹے کو قربان گاہ میں لے جانا۔

(iii) بابل کے بتوں کو توڑنا نتیجۃً آگ میں پھینکا جانا۔

(iv) ہجرت کرنا اور دیگر علاقوں میں جا کر پیغام حق سنانا۔

(3) کیا امامت سے مراد نبوت ہے؟

بعض مفسرین اہل سنت نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں مقام امامت سے مراد مقام نبوت ہی ہے۔ دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت نبوت سے بالاتر مقام ہے۔

(4) امامت سے مراد:

(i) صرف دنیاوی امور میں لوگوں کی قیادت و پیشوائی۔

(ii) بعض قائل ہیں کہ امامت کا معانی ہے امور دین و دنیا میں پیشوائی۔

(iii) دینی پروگراموں کا ثابت ہونا، حدود احکام الٰہی کا اجراء، ظاہری اور باطنی پہلوؤں سے نفوس کی تربیت و پرورش بھی امامت کے مفہوم میں داخل ہے۔ آیت میں یہی معنی مراد ہے۔

امامت کے مفہوم میں ہدایت بھی شامل ہے **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً ...** یہ ہدایت " **ارائۃ الطریق** " (راستہ دکھانا) کے معنی والی نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مرحلہ امامت سے پہلے مقام نبوت و رسالت اور " **ارائۃ الطریق** " کے مفہوم کی ہدایت کے منصب پر تو یقیناً فائز تھے۔ وہ ہدایت جو امامت کے مفہوم میں داخل ہے "**ایصال الی المطلوب**" روحِ مذہب کو عملی شکل دینا اور نفوسِ آمادہ کی تربیت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔

(5) نبوت، رسالت اور امامت میں فرق:

مقام نبوت میں نبی کا کام وحی کے ذریعے جو کچھ اسے معلوم ہو اگر لوگ چاہیں تو انہیں بتا دے۔ مقام رسالت میں رسول کا کام اپنی معموریت کے خطے میں جستجو اور کوشش کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینا ہے۔ مقام امامت

میں امام کا کام احکام وقوانین الٰہی کا اجراء ہے۔ ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ نبی اور رسول کا کام ''ارایۃ الطریق'' ہے۔ جبکہ امام کی ذمہ داری ''ایصال الی المطلوب'' ہے۔

(6) عہدۂ امامت حضرت ابراہیمؑ کی سیر تکامل کی آخری منزل تھی:

جو سمجھتے ہیں کہ امامت کا مقصد دوسرے کے لیے نمونہ اور ماڈل ہونا ہے تو یہ صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ میں ابتدائے نبوت سے موجود ہوتی ہے۔ لہذا عہدۂ امامت حضرت ابراہیمؑ کی سیر تکامل کی آخری منزل تھی۔

(7) ظلم کسے کہتے ہیں؟

''لا ینال عھدی الظالمین'' میں ظلم عدل کے مقابلے میں ہے۔ عدالت کا حقیقی معنی ہے ''ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا۔'' اس بنا پر ظلم کا مفہوم یہ ہوگا: ''کسی شخص یا چیز کو ایسے مقام پر رکھنا جس کے لیے وہ اہل نہیں ہے۔''

(8) حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے مراد:

(i) قرآن مجید کے فرمان وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا کے مطابق امامت ایمانِ کامل اور مقامِ یقین کی منزل تک رسائی کا نام ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے عالم ملکوت ظاہر کر دیے گئے۔ نتیجۂ مقام ولایت کے حاصل ہوتے ہی آپ یقین کی منزل پر بھی فائز ہوئے۔

اس آیت اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ .. سے یہ واضح ہے کہ ہادی دو قسم کے ہیں۔ ایک جو لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلاتا ہے اپنی ہدایت کے لیے غیروں کا محتاج نہیں۔ دوسرا وہ جو لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلاتا ہے۔ مگر اپنی ہدایت کے لیے غیروں کا محتاج ہے۔

(ii) امامت ہدایت کی ہی ایک قسم ہے جو نبوت اور رسالت سے بلند درجہ رکھتی ہے۔اس آیت " وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا " کے ضمن میں ہدایت بہ امر کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ طباطبائی میں فرماتے ہیں: ہدایت جو منصب امامت ہے یہ نفوس میں تصرف تکوینی کی ایک قسم کا نام ہے۔اس تصرف کے ذریعے امام کا کام دلوں کو کمال کے راستے کی طرف لے جانا ہے۔پس ضروری ہے یہ ہدایت امر تکوینی کی صورت ہو نہ کہ تشریعی۔

(9) امامت کا تعین :

امام خدا کی طرف سے معین ہوتا ہے۔جن لوگوں کی زندگی میں کہیں ظلم کا نشان موجود ہو چاہے اپنے اوپر ہی ظلم کیوں نہ ہو یہاں تک کہ ایک لحظہ کے لئے بت پرستی کی ہو وہ امامت کی اہلیت نہیں رکھتے۔اصطلاح میں کہتے ہیں کہ امام کو اپنی تمام زندگی میں معصوم ہونا چاہیے۔امام کی عصمت کی صفت سے خدا ہی آگاہ ہوتا ہے۔

امام مجبور کر کے لوگوں کو حق تک نہیں پہنچاتا ہے بلکہ اپنے اختیار، آمادگی اور اہلیت سے لوگ امام کے ظاہری و باطنی کمالات سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔جیسے سورج اور بارش سے وہی فیض حاصل کرے گا جس میں صلاحیت ہو۔

جب وحی الٰہی کے نزول کا مرحلہ اور تمام احکام کا ابلاغ انجام کو پہنچ چکا ہو اور صرف نفاذ کی منزل باقی ہو تو جانشین پیغمبر اجرائے احکام کا کام جاری رکھ سکتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں کہ خود نبی یا رسول ہو۔

خود آزمائی

1. آیت امامت میں "کلمات" سے کیا مراد ہے؟
2. اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو عہدہ امامت عطا کرنے کے لیے مختلف امتحانات میں آزمانے کی شرط کیوں لگائی کیا اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے؟
3. حضرت ابراہیم کے امتحانات بیان کریں؟
4. کیا عہدہ امامت سے مراد نبوت ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو دلائل سے ثابت کریں کہ عہدہ امامت عہدہ نبوت سے بلند و بالا مرتبے کا نام ہے؟
5. امامت سے کیا مراد ہے نیز "اِیْصَالٌ اِلَی الْمَطْلُوْبِ" کی وضاحت کریں؟
6. نبوت، رسالت اور امامت میں فرق واضح کریں؟
7. کیا عہدہ امامت حضرت ابراہیمؑ کی آخری سیر تکامل تھی؟
8. ظلم سے کیا مراد ہے اور آیت میں لاینال عھدی الظالمین کی وضاحت کریں؟
9. قرآن کی روشنی میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت کی وضاحت کریں؟
10. امام کا تعین کس طرف سے ہوتا ہے؟
11. کیا خدا کے سواء عصمت کی صفت سے کوئی اور آگاہ ہوسکتا ہے؟
12. اگر امام کا کام ایصال الی المطلوب یعنی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا تو اس مفہوم کے اعتبار سے سرکار رسالتؐ اور آئمہؑ کے ہاتھوں عمل شکل تو اختیار نہیں کی بلکہ ان کے مقابلے میں ہمیشہ گنہگار اور گمراہ لوگ بر سر اقتدار رہے۔ وضاحت کریں؟
13. اگر امامت نبوت اور رسالت سے بلند مرتبہ ہے تو کیا ضروری نہیں ہے کہ ہر امام پہلے نبی یا رسول ہو جبکہ رسالت مآبؐ کے معصومؑ جانشین ایسے تو نہ تھے؟

7

آیت ولایت

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ
وَ ھُمْ رٰکِعُوْنَ O (سورہ مائدہ5 آیت55 پارہ6)

ترجمہ: تمہارا ولی صرف خدا، اس کا پیغمبرؐ اور وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ انھوں نے نماز قائم کی ہے اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے۔

تفسیر

شان نزول:

تفسیر مجمع البیان اور دوسری کتب میں عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے:

ایک روز میں چاہِ (کنواں) زمزم کے پاس بیٹھا تھا اور لوگوں کو ارشاداتِ رسولؐ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص قریب آیا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ جب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث نقل کرتا تو وہ بھی "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کہہ کر دوسری حدیثِ رسولؐ بیان کر دیتا۔

ابن عباسؓ نے اس شخص کو قسم دی کہ وہ اپنا تعارف کروائے تو اس نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دی اور پکار کر کہا اے لوگو! جو شخص مجھے نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاریؓ ہوں۔ ان کانوں سے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے کان بہرے ہو جائیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

عَلِیٌّ قَائِدُ الْبَرَرَةِ وَقَاتِلُ الْکُفْرَةِ مَنْصُوْرٌ مَنْ نَصَرَهُ مَخْذُوْلٌ مَنْ خَذَلَهُ

"حضرت علی علیہ السلام نیک اور پاک لوگوں کے قائد ہیں اور کفار کے قاتل ہیں۔ جو ان کی نصرت و مدد کرے خدا اس کی مدد کرے گا اور جو شخص ان کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لے خدا بھی اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا۔"

اس کے بعد ابوذر غفاریؓ نے مزید کہا: اے لوگو! ایک دن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک سائل مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی۔ لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا تو اس نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہا: خدایا: گواہ رہنا کہ میں نے تیرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مسجد میں مدد طلب کی ہے لیکن کسی نے مجھے جواب تک نہیں دیا۔ ایسی حالت میں جبکہ حضرت علی علیہ السلام رکوع میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی (سب سے چھوٹی انگلی) سے اشارہ کیا۔ سائل قریب آیا اور انگوٹھی آپؑ کے ہاتھ سے اتار لی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جو حالت نماز میں تھے اس واقعہ کو دیکھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سر آسمان کی طرف بلند کیا اور اس طرح کہا: خدایا میرے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی روح کو وسعت دے اور ان کے کام ان پر آسان کردے اور ان کی زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ ان کی گفتار کو سمجھ سکیں۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور مددگار قرار دے اور ان کے ذریعے ان کی قوت میں اضافہ فرما اور انھیں ان کے کاموں میں شریک کر دے۔ خداوندا! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں میرے سینہ کو کھول دے، میرے کام مجھ پر آسان کر دے اور میرے خاندان میں سے علیؑ کو میرا وزیر بنا دے تاکہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط اور قوی ہو جائے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں: ابھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرائیلؑ نازل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے کہا: پڑھیے! حضورؐ نے فرمایا: کیا پڑھوں؟ تو جبرئیل نے کہا: پڑھیے! اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.. یہ شان نزول تفصیلات کے کچھ اختلاف کے ساتھ مختلف طرق سے نقل ہوئی ہے البتہ اصل اور بنیاد سب روایات کی ایک ہی ہے۔

اہم نکات:

یہ آیت لفظ "اِنَّمَا" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ لفظ لغتِ عرب میں حصر وانحصار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: " تمہارے ولی، سر پرست اور تمہارے امور میں حق تصرف رکھنے والی تین ہستیاں ہیں۔ خدا، اس کا رسول اور وہ جو ایمان لائے، نماز قائم کی اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ لفظ "رکوع" اس آیت میں نماز کے رکوع کے معنی میں ہے نہ کہ خضوع وخشوع (نہایت عاجزی اور انکساری) کے معنی میں کیونکہ عرفِ شریعت اور اصطلاح قرآن میں جب رکوع کہا جائے تو اسی مشہور معنی میں یعنی نماز کے رکوع کے معنی میں ہوگا۔ نیز آیت کی شان نزول اور متعدد روایات جو حضرت علی علیہ السلام کے حالت رکوع میں انگوٹھی عطا فرمانے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ جنہیں ہم تفصیل سے ذکر کریں گے کے علاوہ "یقیمون الصلوۃ" بھی اس بات پر شاہد ہے قرآن میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ جس میں یہ ہو کہ زکوٰۃ خضوع سے ادا کرو بلکہ زکوٰۃ خلوص نیت سے اور احسان جتلائے بغیر ادا کرنی چاہیے۔

اسی طرح اس میں بھی شک نہیں کہ لفظ "ولی" اس آیت میں دوست یا مددگار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ دوستی اور مدد کرنے کے معنی میں ولایت نماز پڑھنے والوں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرنے والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک عمومی حکم ہے جو تمام مسلمانوں پر محیط ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے دوستی رکھیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہاں تک کہ وہ بھی جن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر زکوٰۃ ادا کریں انھیں بھی چاہیے کہ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار رہوں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "ولی" سے مراد ولایت بمعنی

سرپرستی، تصرّف اور مادّی وروحانی رہبری اور قیادت ہے خصوصاً جبکہ یہ ولایتِ الٰہی اور ولایتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ہم پلّہ قرار پائی ہے اور تینوں کو ایک ہی لفظ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حضرت علی علیہ السلام کی امامت اور ولایت پر نصِ قرآنی کی حیثیت سے دلالت کرتی ہیں۔

اس موقع سے متعلق کچھ اہم بحثیں ہیں جن پر ہم علیحدہ علیحدہ تحقیق کرتے ہیں۔

احادیث، مفسرین اور مورخین کی شہادت:

بہت سی اسلامی کتب اور اہل سنت کے منابع میں اس ضمن میں متعدد روایات موجود ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں حالت رکوع میں انگوٹھی دینے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جب کہ بعض میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ فقط اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونا ہی مذکور ہے۔

اس روایت کو ابن عباسؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن سلامؓ، سلمہ بن کمیلؓ، انس بن مالکؓ، عتبہ بن حکیمؓ، عبداللہ ابیؓ، عبداللہ بن غالبؓ، جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور ابوذر غفاریؓ نے بیان کیا ہے۔[۱]

ان مذکورہ دس افراد کے علاوہ اہل سنت کی کتب میں یہ روایت خود حضرت علی علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔[۲]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کتاب غایۃ المرام میں اس بارے میں 24 احادیث کتب اہل سنت سے اور 19 احادیث طرقِ شیعہ سے نقل کی گئی ہیں۔[۳]

[۱] احقاق الحق جلد 2 صفحہ 399 تا 410 سے رجوع کریں [۲] المراجعات صفحہ 155

[۳] منہاج البراعہ جلد 2 صفحہ 25

مشہور کتب کہ جن میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے تیس سے زیادہ ہیں جو کہ سب اہل سنت کے منابع ومصادر میں سے ہیں ان میں سے یہ بھی ہیں:

1. ذخائر العقبیٰ ص88 از محب الدین طبری
2. تفسیر فتح القدیر جلد2 صفحہ50 از علامہ شوکانی
3. جامع الاصول جلد9 صفحہ478
4. اسباب النزول صفحہ148 از واحدی
5. لباب النقول صفحہ90 از سیوطی
6. تذکرہ صفحہ18 از سبط ابن جوزی
7. نورالابصار صفحہ105 از شبلنجی
8. تفسیر طبری صفحہ165
9. الکافی الشاف صفحہ56 از ابن حجر عسقلانی
10. مفاتیح الغیب جلد3 صفحہ431 از رازی
11. درالمنثور جلد2 صفحہ393 از سیوطی
12. کنز العمال جلد6 صفحہ391
13. مسند ابن مردودیہ
14. مسند ابن الشیخ
15. صحیح نسائی
16. الجمع بین الصحاح الستہ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب میں اس ضمن میں احادیث موجود ہیں۔[1]

ان حالات میں کیسے ہوسکتا ہے کہ ان تمام احادیث کی پرواہ نہ کی جائے جبکہ دیگر آیات کی شانِ نزول کے لیے ان سب روایات اور ان سب علماء کی گواہیوں کی طرف توجہ دی جائے اگر بنا یہ ہو کہ کسی آیت کے سلسلے میں اس قدر روایات کی بھی پرواہ نہ کی جائے تو پھر ہمیں قرآنی آیات کی تفسیر میں کسی بھی روایت کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بہت کم آیات ایسی ہیں جن کی شانِ نزول میں اس قدر روایات وارد ہوئی ہوں۔

یہ مسئلہ اس قدر واضح تھا کہ زمانہ پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسّان بن ثابتؓ نے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں روایت کے مضمون کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

[1] مزید تفصیل کے احقاق الحق جلد2، الغدیر جلد2 اور المراجعات کی طرف رجوع کریں

فَـاَنْـتَ الَّـذِیْ اَعْـطَیْـتَ اِذْکُنْـتَ رَاکِعًا
زَکَـاتًـا فَـدَتکَ الـنَّـفْسُ یَاخَیْـرَ رَاکِعٍ
فَـاَنْـزَلَ فِیْکَ الـلّٰــهُ خَیْـرَ وَلَایَۃٍ
وَ بَیَّـنَهَـا فِیْ مُـحْـکَـمَاتِ الشَّـرَایِعِ

”آپؑ وہ ہیں کہ جنہوں نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی آپ پر جان فدا ہو۔ اے بہترین رکوع کرنے والے اور اس کے بعد خدا نے بہترین ولایت آپ کے بارے میں نازل کی اور قرآن مجید میں اسے ثبت کر دیا۔“[1]

اہل سنت کے بعض مفسرین نے اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے سے انکار کیا ہے اور اسی طرح ”ولایت“ کی تفسیر سرپرستی تصرف اور امامت کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ان میں سے اہم اعتراضات پر ہم پر یہاں تحقیق کرتے ہیں۔

1. ”الذین“ جمع کا صیغہ ہے:

ایک اعتراض یہ ہے کہ آیت میں "الـذین" جمع کا صیغہ ہے۔ لہٰذا اس آیت کو ایک شخص کے متعلق کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت کہتی ہے کہ تمہارے ”ولی“ وہ اشخاص ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی ادبیات میں ایسا بارہا دکھائی دیتا ہے کہ مفرد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

مثالیں ملاحظہ ہوں: آیۂ مباہلہ میں لفظ ”نسـائنا“ جمع کی صورت میں ہے جبکہ اس سے مراد جناب حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام ہیں جیسا کہ اس ضمن میں مروی متعدد

[1] حسان بن ثابت کے اشعار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت سی کتب میں نقل ہوئے ہیں ان میں تفسیر روح المعانی از شہاب الدین محمود آلوسی اور کفایۃ الطالب از گنجی شافعی وغیرہ شامل ہیں

شان نزول گواہی دیتی ہیں۔آیت مباہلہ ہی میں لفظ "انفسنا" جمع کی صورت میں ہے جب کہ مباہلہ کے لیے جانے والوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے علاوہ صرف حضرت علی علیہ السلام تھے۔

جنگ احد کے ایک واقعہ کے سلسلے میں سورۃ آل عمران آیت 173 میں ہے:

"اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا "

"(جب) ان سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ کفار نے تمھارے (مقابلے کے لیے (لشکر کثیر) جمع کیا ہے تو ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا۔"

بعض مفسریں نے اس کی شان نزول نقل کی ہے جس میں "الذین" سے ایک ہی شخص نعیم بن مسعود مراد لیا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ 5 آیت 52 میں ہے: " يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ " [1]

اس میں بھی جمع کے صیغے ہیں۔حالانکہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے میں وارد ہوئی ہے

علاوہ ازیں: سورۃ ممتحنہ آیت 1، سورۃ المنافقون آیت 8، سورۃ البقرہ آیت 215,274 وغیرہ میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جمع کی شکل میں ہیں لیکن ان کی شان نزول کے مطابق ان سے ایک ہی شخص مراد تھا۔

ایسی تعبیرات یا تو اس شخص کی حیثیت اور مقام کی اہمیت اور اس کے کام کے نقش مؤثر واضح کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا اس لیے کہ حکم کو کلی صورت میں پیش کیا جائے اگر چہ اس کا مصداق ایک ہی فرد ہو۔خدا ایک ہے اس کے لیے قرآن مجید میں بہت سی آیات میں جمع کی ضمیر تعظیم کے طور پر ہی استعمال ہوئی ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر قرینہ کے خلاف ظاہر مفرد کے لیے جمع کا

[1] وہ کہتے ہیں کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانہ کی گردش نہ آجائے

استعمال جائز نہیں ہے۔لیکن آیت کی شان نزول میں وارد ہونے والی تمام روایات ہمارے پاس واضح قرینہ کے طور پر موجود ہیں۔جبکہ دوسرے مواقع پر اس سے کم قرینہ پر بھی قناعت کرلی جاتی ہے۔

2. حالت رکوع میں زکوٰۃ:

فخرالدین الرازی اور بعض دوسرے حضرات نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام تو نماز میں مخصوص توجہ رکھتے تھے یہاں تک مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حالت نماز میں تیر کا پھل آپؑ کے پاؤں سے نکالا گیا اور آپؑ متوجہ نہیں ہوئے۔پھر کیسے ممکن ہے کہ آپؑ نے سائل کی آواز سن لی اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے اس نکتہ سے غافل ہیں کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا اپنی طرف متوجہ ہونا نہیں ہے۔بلکہ عین خدا کی طرف توجہ کرنا ہے۔حضرت علی علیہ السلام حالت نماز میں بجائے اپنے خدا کی طرف متوجہ تھے۔لہٰذا درگاہ خدا میں کی گئی سائل کی شکایت کو حضرت علی علیہ السلام کا سننا تعجب نہیں ہونا چاہیے۔یہ بھی واضح رہے کہ مخلوق خدا سے غفلت اور بیگانگی دراصل خدا سے غفلت اور بیگانگی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالت نماز میں زکوٰۃ دینا عبادت کے اندر عبادت ہے نہ کہ عبادت کے دوران ایک عمل مباح کی انجام دہی۔

ایک اور عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بات جو روح عبادت سے مناسبت نہیں رکھتی یہ ہے کہ کوئی شخص عبادت کے دوران مادی اور شخصی زندگی سے مربوط ہو جائے۔لیکن ان امور کی طرف متوجہ ہونا جو رضائے الٰہی کا ذریعہ ہیں روح عبادت کے لیے سازگار ہیں بلکہ عبادت کے لیے بلند مرتبے کا باعث ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ خدا کی طرف توجہ کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بے اختیار ہو کر اپنا احساس کھو بیٹھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد و ارادہ سے اپنی توجہ ایسی ہر چیز سے پھیر لیتا ہے جو راہ خدا کے لیے نہیں ہے۔

صاحب تفسیر کبیر فخر الدین رازی کی گفتگو باعث تعجب ہے کہ اس نے حضرت علی علیہ السلام کے اشارہ کرنے اور سائل کے انگشتری اتارنے کو حضرت علی علیہ السلام کا نماز میں "فعل کثیر" قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں نماز میں درست نہیں۔ حالانکہ فخر الدین رازی نماز میں ایسے کام انجام دینا جائز سمجھتے ہیں جو اس اشارہ سے کئی درجہ زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود نماز کے لئے نقصان دہ نہیں ہیں یہاں تک کہ حشرات الارض مثلاً سانپ یا بچھو کو مارنا بچے کو اٹھانا اور بٹھانا یہاں تک کہ شیر خوار بچے کو دودھ پلانے کو تو وہ نماز میں فعل کثیر نہیں سمجھتے۔ لہٰذا صرف ایک اشارہ فعل کثیر کس طرح ہو گیا لیکن جب کسی کی دانش مندی طوفان تعصب میں پھنس جاتی ہے تو پھر ایسے تعصّبات اس کے لیے باعث تعجب نہیں رہتے۔

3. لفظ "ولی" [1] کا مفہوم:

آیت پر ایک اور اعتراض لفظ "ولی" کے معنی کے بارے کیا گیا ہے اور اس سے مراد "دوست اور مدد کرنے والا" لیا گیا ہے نہ کہ "متصرف، سرپرست اور صاحب اختیار"۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر کے بارے میں اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ "ولی" سے یہاں دوست اور مدد کرنے والا مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ صفت تو تمام مومنین کے لئے ثابت ہے نہ کہ ان مخصوص مومنین کیلئے جو آیت کے مطابق نماز قائم کریں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیں۔

[1] لفظ "ولی" کے معنی کی مزید وضاحت کے لیے ہماری کتاب "فرمانِ رسولؐ" صفحہ 89 میں ملاحظہ فرمائیں

دوسرے لفظوں میں دوستی اور مدد ایک عام حکم ہے جبکہ آیت ایک خصوصی حکم بیان کر رہی ہے۔ اسی لئے تو ایمان کا ذکر کرنے کے بعد خاص صفات بیان کی جا رہی ہیں جو ایک شخص کے ساتھ مخصوص ہیں۔ [1]

4. حضرت علی علیہ السلام پر واجب زکوٰۃ :

کہا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام پر کون سی زکوٰۃ واجب تھی جبکہ وہ مال دنیا میں سے اپنے لئے کچھ فراہم ہی نہ کرتے تھے اور اگر اس سے مراد مستحب صدقہ ہے تو اسے زکوٰۃ نہیں کہا جا سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو تواریخ گواہی دیتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے بہت سا مال کمایا تھا اور اسے راہ خدا میں صرف کر دیا تھا۔ یہاں تک لکھا ہے کہ آپ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے آزاد کرائے۔ علاوہ ازیں آپ کو مختلف جنگوں کے مال غنیمت میں سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ لہٰذا کچھ ایسا مال یا کوئی چھوٹا سا کھجوروں کا باغ جس کی زکوٰۃ ادا کرنا آپ پر واجب ہو اس وقت ہونا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فوراً ادا کرنے کے وجوب کی فوریت ''عرفی فوریت'' ہے جو نماز پڑھتے ہوئے ادا کرنے کے منافی نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مستحب زکوٰۃ کو قرآن مجید میں بہت مرتبہ زکوٰۃ کہا گیا ہے۔ بہت سی مکی سورتوں میں یہ لفظ زکوٰۃ آیا ہے۔ جس سے مراد مستحب زکوٰۃ ہی ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ واجب زکوٰۃ کا حکم پیغمبرِ اسلام کی ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوا۔ [1]

[1] (سورہ نمل آیت 3، سورہ روم آیت 39، سورۃ لقمان آیت 4، سورۃ فصلت آیت 7 وغیرہ)

5. آیت میں ''ولایت بالفعل'' کا ذکر ہے:

اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر ہم حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل پر ایمان بھی لے آئیں تب بھی یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ اس کا تعلق زمانۂ پیغمبرؐ کے بعد سے ہے لہٰذا حضرت علی علیہ السلام نزول آیت کے وقت ولی نہ تھے۔ دوسروں لفظوں میں اس وقت ان کے لئے " **ولایت بالقوۃ** " تھی "**ولایت بالفعل**" نہ تھی جبکہ آیت ظاہراً ''ولایت بالفعل'' کا ذکر کر رہی ہے۔

جواب یہ ہے کہ روز مرہ کی گفتگو میں ایسی ادبی تعبیرات بہت دکھائی دیتی ہیں۔لوگوں کے لئے ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جو وہ بالقوۃ ہیں مثلاً انسان اپنی زندگی میں وصیت کرتا ہے اور کسی شخص کو اپنے بچوں کے لئے وصی معین کرتا ہے اور اسی وقت سے وصی کا لفظ اس شخص کے لئے بولے جانے لگتے ہیں جبکہ وصیت کرنے والا ابھی زندہ ہوتا ہے۔

شیعہ سنی طرق سے پیغمبرؐ سے جو روایات حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں مروی ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے انہیں ''میرے وصی'' اور میرے خلیفہ'' کہہ کر خطاب کیا۔

قرآن مجید میں ایسی تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے خدا سے یہ درخواست کی:

" فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّاo يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ "(سورۃ مریم آیت 5,6)

''مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما جو میری اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو''

حالانکہ مسلم ہے کہ ''ولی'' سے یہاں مراد ''سرپرست'' ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوگا۔ بہت سے لوگ اپنے جانشین اپنی زندگی میں معین کرتے ہیں اور اسی وقت سے اسے جانشین کہنے لگتے

ہیں حالانکہ وہ ''بالقوۃ'' ہی ہوتے ہیں ''بالفعل'' نہیں ہوتے۔

6. حضرت علیؑ نے اس واضح دلیل سے خود استدلال کیوں نہیں کیا؟

جیسا کہ آیت کی شان نزول کے بارے میں روایات کی بحث کے ضمن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہ حدیث متعدد کتب میں خود حضرت علی علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے جیسا کہ مسند ابن مردویہ، مسند ابی شیخ اور کنز العمال میں ہے۔ یہ بات درحقیقت اس آیت سے آپ کا استدلال ہی ہے۔ کتاب ''الغدیر'' میں کتاب سلیم بن قیس حلالی سے ایک مفصل حدیث نقل کی گئی ہے جس کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نے میدان صفین میں کچھ لوگوں کی موجودگی میں اپنی حقانیت پر دلائل پیش کیے۔ ان میں سے ایک استدلال اسی آیت سے تھا۔ (الغدیر جلد 1 صفحہ 196)

غایۃ المرام میں حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے: حضرت علی علیہ السلام نے شوریٰ کے دن بھی اس آیت سے استدلال کیا تھا۔ (منقول از منہاج البراعۃ جلد 2 صفحہ 363)

ولایت مطلق:

زیر بحث آیت میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ولی مطلق ہیں۔ اللہ صاحبِ اختیار یعنی بالذّات ولی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بالذات ولی نہیں ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ولایت تامہ اور مطلقہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ اسی طرح مومنین کو جو ولایت دی گئی وہ آیت میں حرف عطف سے مذکور ہے۔ اگر مومنین کے لیے اللہ کی منشاء ولایت مطلق نہ ہوتی تو ولایت کا دوبارہ تکرار ہوتا آیت میں حرف عطف نہ آتا۔ تو واضح ہوا کہ اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور مومنین تینوں یکساں طور پر ولایت مطلق رکھتے

ہیں یعنی اللہ ولی مطلق ہے اس کا رسول ولی مطلق ہے اور مومنین ولی مطلق ہیں۔ البتہ یہ تخصیص ضرور ہے کہ خدا بالذات ولی مطلق ہے۔ رسول اور مومنین بالعرض ولی مطلق ہیں۔

7. قبل اور بعد کی آیات سے آیت ولایت کا ربط:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبل اور بعد کی آیات سے ولایت وامامت والی تفسیر مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ان میں ولایت دوستی کے معنی میں آئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآنی آیات جو کہ تدریجاً اور مختلف واقعات میں نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کا تعلق ان حوادث اور واقعات سے ہے جن کے سلسلے میں وہ نازل ہوئی ہیں نہ کہ ایک سورۃ کی آیات یا یکے بعد دیگرے آنے والی آیات ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں یا مفہوم ومعنی کے اعتبار سے ہمیشہ نزدیکی تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آیات ایک دوسرے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا تعلق دو مختلف واقعات سے ہے۔ مختلف واقعات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دونوں معنی ومفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

جیسا کہ شان نزول شاہد ہے آیت "انما ولیکم اللّٰہ..." حضرت علی علیہ السلام کے حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے قبل اور بعد کی آیات جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں اور پڑھیں گے دوسرے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کے ایک دوسرے سے تعلق کی بات کا زیادہ سہارا نہیں لیا جا سکتا۔

اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث آیت گذشتہ اور پیوستہ آیات سے کچھ مناسبت بھی رکھتی ہے۔ کیونکہ دوسری آیات میں ولایت بمعنی دوستی اور مدد کے ہے۔ جبکہ زیر بحث آیت میں ولایت رہبری اور سرپرستی کے مفہوم میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ولی سرپرست اور

متصرف اپنے پیروکاروں کا دوست اور یار و مددگار بھی ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں دوست اور مددگار ہونا ولایت مطلقہ کے کوائف اور اوصاف میں سے ہے۔

8. ایسی قیمتی انگشتری کہاں سے آئی تھی؟

کہا جاتا ہے کہ ایسی قیمتی انگوٹھی جو تاریخ میں بیان ہوئی ہے حضرت علی علیہ السلام کہاں سے لائے تھے ایسی غیر معمولی قیمت کی انگوٹھی پہننا اسراف (فضول خرچی) بھی ہے تو کیا یہ بات اس کی دلیل نہیں کہ مذکورہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت کے بارے میں جو مبالغے کیے گئے ہیں۔وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور اس کے بہت قیمتی ہونے کی ہمارے پاس کوئی قابل قبول دلیل نہیں ہے۔ایک ضعیف روایت (یہ ضعیف روایت بطور مرسل تفسیر برہان جلد 1 صفحہ 485 پر مذکور ہے) میں اس کی قیمت خراج شام کے برابر بیان کی گئی ہے۔حقیقت سے زیادہ ایک افسانے سے مشابہت رکھتی ہے اور شاید اس اہم واقعے کی اہمیت کم کرنے کے لئے اسے گڑھا گیا ہے۔صحیح اور معتبر روایات جو آیت کے شان نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ان میں ایسے کسی افسانے کا کوئی ذکر نہیں۔لہٰذا ایسی باتوں سے ایک تاریخی واقعے اور حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔

اگلی آیت گذشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کے ہدف کی تاکید ہے اور مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ جس نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور صاحبان ایمان کی ولایت، سرپرستی اور رہبری کو قبول کرلیا ہے جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا جاچکا ہے وہ کامیاب ہوں گے کیونکہ وہ حزب خدا میں داخل ہوجائیں گے اور حزب خدا کامیاب وکامران ہے:

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ "

اور جو لوگ اللہ اس کے پیغمبرؐ اور صاحبان ایمان کی ولایت قبول کر لیں (وہ کامیاب ہیں کیونکہ) خدا کی حزب اور پارٹی ہی کامیاب ہے۔" (المائدہ 5 آیت 56)

اس آیت میں "ولایت" کے معنی پر ایک اور قرینہ موجود ہے جس کا ذکر گذشتہ آیت کے ذیل میں کیا گیا ہے یعنی "ولایت" بمعنی "سرپرستی، تصرف اور رہبری"۔ کیونکہ "حزب اللہ" اور اس کا غلبہ حکومت اسلامی سے متعلق ہے نہ کہ ایک عام اور معمول کی دوستی سے۔ یہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ آیت میں "ولایت" سرپرستی حکومت نیز اسلام و مسلمانوں کی باگ دوڑ ہاتھ میں لینے کے معنی میں ہے۔ کیونکہ "حزب" کے مفہوم میں ایک طرح کی تشکیل، وابستگی اور مشترک اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک اجتماع کا تصور پوشیدہ ہے۔ توجہ رہے کہ "الذین امنوا" سے اس آیت میں تمام صاحب ایمان مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہی شخص ہے جس کی طرف معین اوصاف کے ساتھ گذشتہ آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔

کیا آیت میں حزب اللہ کی کامیابی سے مراد صرف معنوی (باطنی، روحانی) کامیابی ہے یا اس میں ہر طرح کی معنوی و مادی کامیابی شامل ہے؟

اس میں شک نہیں کہ آیت کا اطلاق حزب اللہ کی عام محاذوں پر مطلق کامیابی کی دلیل ہے سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی جمعیت حزب اللہ میں شامل ہو یعنی ایمان محکم، تقویٰ، عمل صالح، اتحاد، کامل باہمی اعتماد، آگاہی اور علم رکھتا ہو اور کافی تیاری کیے ہوئے ہو تو بلاتردید وہ تمام معاملات میں کامیاب ہوگا۔ آج اگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی کامیابی میسر نہیں ہے تو اس کا سبب واضح ہے کیونکہ حزب اللہ کی مذکورہ شرائط میں سے زیادہ تر آج مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو توانائیاں اور صلاحیتیں دشمنوں کو شکست دینے کے لئے استعمال ہونی چاہییں۔ زیادہ تر ایک دوسرے کو کمزور کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔

خلاصہ

☆ ''اِنَّمَا'' کامعنی جوعام طور پر ''حصر'' کے لئے ہے۔ حصر سے مراد ''ضَیَّقَ عَلَیۡہِ، اَحَاطَ بِہٖ تنگی کرنا، گیر لینا، احاطہ کرنا'' کے ہیں۔

☆ لفظ ''رکوع'' آیت میں نماز کے رکوع کے معنی میں ہے نہ کہ خضوع وخشوع کے معنی میں۔ ''یقیمون الصلوٰۃ'' بھی اس بات پر شاہد ہے۔

☆ بہت سی اسلامی کتب اور اہل سنت کے منابع میں اس ضمن میں متعدد روایات موجود ہیں کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں حالت رکوع میں انگوٹھی دینے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جبکہ بعض میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔

☆ زمانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مشہور شاعر حسّان بن ثابتؓ نے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں بیان کیا ہے کہ ''آپؑ وہ ہیں کہ جنہوں نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی آپ پر جان فدا ہو۔''

اہم نکات:

1. بلاشبہ "الـذ ین " جمع کا صیغہ ہےلیکن عربی ادبیات میں ایسابارہادکھائی دیتا ہے کہ مفرد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔قرآن میں بھی ایسی بہت سی مثالیں ہیں صیغے جمع کے تھے مراد واحد لیا گیا۔ایسی تعبیرات یا تو اس شخص کی حیثیت،اس کے مقام کی اہمیت اور اس کے کام کو واضح کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا اس لیے کہ حکم کو کلی صورت میں پیش کیا جائے اگر چہ اس کا مصداق ایک ہی فرد ہو۔خدا ایک ہے اس کے لیے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں جمع کی ضمیر تعظیم کے طور پر ہی استعمال ہوئی ہے۔البتہ بغیر قرینہ مفرد کے لیے جمع کا استعمال جائز نہیں ہے۔

2. جبکہ سائل نے شکایت ہی خدا سے کی تھی اور حضرت علی علیہ السلام حالت نماز میں عین خدا کی طرف متوجہ تھے آپؑ نے سائل کی آواز سن لی پھر یہ اعترض کیسا۔آپؑ کا یہ عمل درحقیقت عبادت کے اندر عبادت ہے۔

فخر الدین رازی نے حضرت علی علیہ السلام کے اشارہ کرنے کو"فعل کثیر" قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں نماز میں درست نہیں۔حالانکہ وہ نماز میں ایسے کام انجام دینا جائز سمجھتے ہیں جو اس اشارہ سے کئی درجہ زیادہ ہیں مثلاً سانپ یا بچھو کو مارنا،بچے کو اٹھانا اور بٹھانا وغیرہ

3. لفظ"ولی"اس آیت میں دوست یا مددگار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ"ولی" سے مراد ولایت بمعنی سرپرستی،تصرّف اور مادی وروحانی رہبری اور قیادت ہے خصوصاً جبکہ یہ ولایت ولایتِ الٰہی اور ولایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ہم پلّہ قرار پائی ہے اور تینوں کو ایک ہی لفظ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

4. کہا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام پر کون سی زکوٰۃ واجب تھی۔ واضح رہے کہ آپؑ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے آزاد کرائے۔ مختلف جنگوں کے مال غنیمت میں سے کچھ ایسا مال یا کوئی چھوٹا سا کھجوروں کا باغ جس کی زکوٰۃ ادا کرنا آپ پر واجب ہو اس وقت ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دوم یہ کہ مستحب زکوٰۃ کو قرآن مجید میں بہت مرتبہ زکوٰۃ کہا گیا ہے۔

5. یہ اعتراض کہ آیت ظاہراً ''ولایت بالفعل'' کا ذکر کر رہی ہے نہ کہ ولایت بالقوۃ کا۔ واضح رہے کہ بلاوجہ ولایت بالفعل اور ولایت بالقوۃ کے الفاظ میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مشاہدہ یہی ہے کہ بہت سے لوگ اپنی زندگی میں اپنے جانشین مقرر کرتے ہیں اور اسی وقت سے انہیں جانشین کہنے لگتے ہیں حالانکہ وہ ''بالقوۃ'' ہی ہوتے ہیں ''بالفعل'' نہیں ہوتے۔ شیعہ سنی روایات سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو اکثر ''میرے وصی'' اور ''میرے خلیفہ'' کہہ کر خطاب کیا جب کہ وہ بالفعل خلیفہ اور وصی زمانہ پیغمبرؐ کے بعد بنے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خدا سے ولی مانگا۔ حالانکہ مسلم ہے کہ یہاں ''ولی'' سے مراد ''سرپرست'' ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوگا۔

حضرت علی علیہ السلام نے میدان صفین میں کچھ لوگوں کی موجودگی میں اور شوریٰ کے دن اپنی حقانیت پر دلائل دیتے ہوئے اس آیت سے بھی استدلال کیا۔

6. اللہ بالذات ولی ہے۔ رسولؐ اور مومنین (آئمہؑ) کی ولایت تامہ اور مطلقہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ لہٰذا اللہ، رسولؐ اور مومنین تینوں یکساں طور پر ولایت مطلق رکھتے ہیں۔ البتہ یہ تخصیص ضرور ہے کہ خدا بالذات ولی مطلق ہے۔ رسول اور مومنین بالعرض ولی مطلق ہیں۔

7. کہا جاتا ہے کہ قبل اور بعد کی آیات سے ولایت و امامت والی تفسیر مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ان میں ولایت دوستی کے معنی میں آئی ہے۔

واضح رہے کہ قرآنی آیات تدریجاً اور مختلف واقعات میں نازل ہوئی ہیں۔ایک سورۃ کی آیات یا یکے بعد دیگرے آنے والی آیات ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہیں۔لیکن اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث آیت گذشتہ اور پیوستہ آیات سے مناسبت بھی رکھتی ہے۔

8. واقعہ کی اہمیت کم کرنے کے لیے ایک ضعیف روایت کا سہارا لیا گیا کہ اس انگھوٹھی کی قیمت خراج شام کے برابر ہے۔حقیقت سے زیادہ ایک افسانے سے مشابہت رکھتی ہے۔صحیح اور معتبر روایات جو آیت کے شان نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں ایسے کسی افسانے کا کوئی ذکر نہیں۔

خود آزمائی

1. آیت ولایت کا شان نزول اور لفظ "انما" کا معنی اور مفہوم بیان کریں؟

3. زمانہ پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسان بن ثابتؓ نے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں آیت ولایت کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے کوئی سا ایک شعر سنائیں؟

4. آیت ولایت میں "الذین" جمع کا صیغہ ہے اس سے واحد کیسے مراد لیا جا سکتا ہے؟

5. فخر الدین الرازی کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نماز میں مخصوص توجہ رکھتے تھے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ آپ نے سائل کی آواز سن لی اور اس کی طرف متوجہ ہوئے؟

6. لفظ "ولی" کا معنی بیان کریں اور واضح کریں کہ اس لفظ سے متصرف، سرپرست اور صاحب اختیار کا معنی کیسے مراد لیا جا سکتا ہے؟

7. حضرت علی علیہ السلام مالِ دنیا میں اپنے لیے کچھ بھی جمع نہ کرتے تھے پھر آپ پر کونسی زکوٰۃ واجب تھی جو آپؑ نے حالت رکوع میں دی؟

8. اگر ہم حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلا فصل پر ایمان لے بھی آئیں تو اس کا تعلق زمانہ پیغمبرؐ کے بعد سے ہے کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ نزول آیت کے وقت آپؑ ولی نہ تھے؟

9. خدا بالذات ولی مطلق ہے، رسولؐ اور مومنین (آئمہؑ) بالعرض ولی مطلق ہیں کی وضاحت کریں؟

10. آیت ولایت سے قبل اور بعد والی آیات کو اگر دیکھا جائے تو ولایت بمعنی دوستی بیان ہوئی ہے تو پھر اس آیت سے ولایت و امامت والی تفسیر کیسے مراد لی جا سکتی ہے؟

11. ایسی قیمتی انگوٹھی جو حضرت علی علیہ السلام نے حالت رکوع میں دی وہ انگوٹھی آپؑ کے پاس کہاں سے آئی۔ کیا ایسی غیر معمولی انگوٹھی پہننا اسراف نہیں ہے؟

8

آیت اولی الامر

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ
فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ
كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط ذٰلِكَ
خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ (سورۃ النساء 4 آیت 59 پارہ 5)

ترجمہ: اے ایمان والو خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں سے (رسولؐ ہی کی طرح) صاحبان امر ہوں ان کی طاعت کرو اور اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو پس اگر تم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس امر میں خدا اور پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو۔ یہی (تمہارے حق میں) بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔

تفسیر

یہ آیت اور بعد کی چند آیتیں ایک اہم ترین اسلامی مسئلے یعنی مسئلہ رہبری کے بارے میں بحث کررہی ہیں اور مسلمانوں کے مختلف دینی اور اجتماعی مسائل میں حقیقی مراجع (جن کی طرف رجوع کیا جائے) کو متعین کرتی ہیں سب سے پہلے ایمانداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی اطاعت کریں اور یہ بات روشن ہے کہ ایک ایماندار شخص پر واجب ہے کہ اس کی تمام اطاعتوں کی انتہا خداوند عالم کی اطاعت پر ہو اور اس کے حکم کے مطابق ہر قسم کی رہبری کا سرچشمہ اس کی ذات گرامی ہو۔ کیونکہ جہان ہستی کا مالک تکوینی اور حاکم اعلیٰ وہی ہے۔ اس لیے ہر قسم کی حاکمیت و مالکیت اسی کے فرمان کے مطابق ہونی چاہیے **يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ ۔**

دوسرے مرحلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروری کا حکم دیا گیا ہے اور وہ رسولؐ جو معصوم ہے اور کبھی ہوس سے بات نہیں کرتا۔ پیغمبرؐ جو لوگوں میں خدائی نمائندہ ہے جس کی بات خدا کی بات ہے۔ اسے یہ مرتبہ خداوند عالم نے عطا فرمایا ہے۔ اس وجہ سے کہ خدا کی اطاعت تو اس کی ذات کی خالقیت و حاکمیت کی بنا پر ہے لیکن حضورؐ کی اطاعت فرمان پروردگار کی وجہ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا بالذات واجب الاطاعت ہے اور پیغمبرؐ بالغیر واجب الاطاعت ہیں۔ شاید آیت میں اطیعوا کا تکرار اسی

بات کی طرف اشارہ ہے یعنی دونوں اطاعتوں میں فرق یہ ہے واطیعو الرسول ۔

تیسرے مرحلے میں اولواالامر کی اطاعت کا حکم ہے جو اسلامی معاشرے میں سے ہو اور لوگوں کے دین و دنیا کی حفاظت کرے۔

اولواالامر کون ہیں؟

اس کے متعلق مفسرین میں بہت اختلاف ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

1. اہل سنت کے کچھ مفسرین کا نظریہ ہے کہ اولواالامر سے مراد ہر زمانے اور ہر ماحول سے تعلق رکھنے والے بادشاہ اور صاحبان اقتدار ہیں۔ وہ اس میں کسی استثناء کے قائل نہیں ہیں۔اس نظریے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر حکومت کی چاہے وہ کسی شکل میں ہی کیوں نہ ہو پیروری کریں۔ چاہے وہ بُش کی حکومت ہو یا جنرل پرویز مشرف کی۔

2. بعض دوسرے مفسرین مثلا صاحب تفسیر المنار وصاحب تفسیر ظلال القران وغیرہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولواالامر سے مراد عام طبقات کے نمائندے، سربراہ، حکام، علماء اور کوائفِ زندگی کے تمام عہدے دار ہیں لیکن مطلق طور پر نہیں اور کسی شرط ،قید اور پابندی کے بغیر نہیں بلکہ ان کی اطاعت کے لیے یہ پابندی اور شرط ہے کہ ان کے احکام اسلام کے مقرر کردہ احکام کے خلاف نہ ہوں۔

3. بعض مفسرین کا اعتقاد ہے کہ اولواالامر سے مراد وہ معنوی اور فکری رہنما یعنی علماء ہیں جو عادل ہوں اور کتاب وسنت سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں۔

4. بعض اہل سنت کے مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اس لفظ سے مراد پہلے چار خلفاء ہیں اور یہ لفظ انہیں تک محدود ہے اس وجہ سے دوسرے زمانوں میں اولواالامر نہ ہوگا۔

5. بعض مفسرین اولوا الامر سے مراد اصحاب پیغمبرؐ لیتے ہیں۔

6. اولوا الامر کی تفسیر میں ایک اور احتمال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اسلامی لشکروں کے سپہ سالار ہیں۔

7. تمام شیعہ مفسرین اس سلسلے میں ایک متفق نظریہ رکھتے ہیں کہ اولوا الامر سے مراد آئمہ معصومینؑ ہیں۔ جن کو تمام امور زندگی میں اسلامی معاشرے کی مادی اور روحانی رہنمائی خدا اور پیغمبرؐ کی طرف سے سپرد کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ لفظ کسی اور پر صادق نہیں آتا۔ البتہ ایسے لوگ جو ان کی طرف سے کسی مرتبے یا عہدے کے لیے مقرر کیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے کسی عہدہ پر فائز ہوں تو معینہ شرط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولوا الامر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اولوا الامر کے نمائندے ہیں۔ اب ہم مندرجہ بالا تفاسیر کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پہلی تفسیر کسی طرح بھی مفہوم آیت اور تعلیمات اسلامی کی رو سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر حکومت کی اطاعت و پیروی کسی قید و شرط کے بغیر خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ ملا دی جائے۔ اسی بناء پر شیعہ مفسرین کے علاوہ اہل سنت کے بڑے بڑے مفسرین نے بھی اس کی نفی کی ہے۔

دوسری تفسیر بھی آیت کے معنی و مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں کیونکہ آیت اولوا الامر کی اطاعت کو بغیر کسی قید شرط کے لازم اور واجب قرار دیتی ہے۔

تیسری تفسیر یعنی اولوا الامر کی تفسیر کتاب وسنت سے آگاہ علماء عادل کے ساتھ کرنا بھی آیت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ علماء کی اطاعت بھی کچھ شرائط سے مشروط ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی بات کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔ اس وجہ سے اگر وہ اشتباہ میں پڑ جائیں (کیونکہ وہ معصوم نہیں ہیں اس لیے انہیں اشتباہ ہوسکتا ہے) یا اور کسی وجہ سے حق

سے منہ موڑ لیں تو اس صورت میں ان کی اطاعت ضروری نہیں ہوگی جبکہ آیت اولوالامر کی اطاعت مطلق اطاعت پیغمبرؐ کی طرح لازم قرار دے رہی ہے۔علاوہ ازیں علماء کی اطاعت کو ان احکام میں ہے جن کا وہ کتاب وسنت سے استفادہ کرتے ہیں۔اس بنا پر ان کی اطاعت خدا تعالیٰ اور پیغمبرؐ کی اطاعت کے علاوہ کچھ نہیں اس لیے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

چوتھی تفسیر اولوالامر کو پہلے چار خلفا تک محدود کر دینا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں لفظ اولوالامر کا کوئی مصداق نہیں ہے اور پھر اس تخصیص کے بارے میں کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

پانچویں اور چھٹی تفسیر میں اس کو صحابہؓ یا افسران لشکر کے ساتھ مخصوص کرنا اس پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اہل سنت کے بعض مفسرین جیسے مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ اور معروف مفسر فخر الدین کی باتوں کے مطابق اولوالامر کے معنی وہ ہیں جنہیں دوسرے نمبر پر بیان کیا گیا ہے۔ان کی نظر میں اس کے مجموعی مفہوم میں اسلامی معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندے وہ عالم ہوں یا حاکم اور دوسرے طبقوں کے نمائندے شامل ہیں۔وہ انہیں کچھ شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ اولوالامر مانتے ہیں اور ان کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان ہوں جیسا کہ "منکم" سے معلوم ہوتا ہے۔ان کا حکم کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔وہ اپنے اختیار سے حکم دیں نہ کہ مجبوری سے۔وہ مسلمانوں کے مصالح کے مطابق حکم دیں اور صرف انہیں مسائل کا حکم دے سکتے ہیں جن میں انہیں حق ہے نہ کہ عبادات اور ان چیزوں کا جو اسلام نے مقرر اور معین کر دی ہیں۔وہ اس مسئلہ کا حکم دینے کا حق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نص شرعی نہ ہو۔ان سب چیزوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ

سب متفقہ طور پر اپنا نظریہ پیش کریں۔ان کا خیال یہ ہے کہ تمام امت یا ان سب کے نمائندے مل کر غلطی نہیں کر سکتے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ امت اجتماعی طور پر معصوم ہے۔ ان شرطوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے حکم کی اطاعت مطلق طور پر ہر قسم کی پابندی کے بغیر رسول اکرمؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہوگی (اس گفتگو کا نچوڑ یہ ہے کہ اجماع امت حجت ہے) لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر میں بھی کئی اشکالات موجود ہیں۔ کیونکہ اول تو اجتماعی مسائل میں فکر ونظر کا اتفاق بہت ہی کم مواقع پر ہوتا ہے اس لیے مسلمانوں کے زیادہ تر حالات وواقعات میں ہمیشہ بے چینی اور بے اطمینانی رہے گی۔اگر وہ اکثریت کے نظریہ کو قبول بھی کرنا چاہیں تو پھر یہ اشکال سامنے آئے گا کہ اکثریت کبھی معصوم نہیں ہوتی اس لیے ان کی اطاعت مطلق ہونے کی حیثیت سے لازمی نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ علمِ اصول میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ امام معصوم کو نکال کر تمام امت کے معصوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی تفسیر کے طرفداروں نے ایک شرط کا ذکر کیا ہے کہ ان کا حکم کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بات کی تشخیص کون کرے گا کہ یہ حکم کتاب وسنت کے مطابق ہے یا خلاف۔

واحد تفسیر جو مذکورہ اعتراضات کی زد میں نہیں آسکتی وہ ساتویں تفسیر ہی ہے (یعنی اولوالامر سے مراد معصوم رہبر اور آئمہؑ ہیں) کیونکہ یہ تفسیر اس وجوب اطاعت کے اطلاق کے ساتھ ہے جس کا مندرجہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے اور یہ اس کے ساتھ سو فیصد موافقت رکھتی ہے کیونکہ مقام ''عصمت'' ایسے امام کے ہر خطا، گناہ اور اشتباہ سے محفوظ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔اس لیے اس کا ہر حکم فرمان پیغمبرؐ کی طرح کسی قید وشرط کے بغیر واجب الاطاعت ہے اور یہ اس امر کی استعداد رکھتا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت

ہم ردیف اور ہم پلہ قرار پائے۔ یہاں تک کہ ''اطیعوا'' کی تکرار کے بغیر اس کا عطف رسولؐ پر ہو۔

ایک قابل توجہ بات:

بعض مشہور علمائے اہل سنت نے بھی جن میں سے مشہور و معروف مفسر فخر الدین الرازی بھی ہیں اس آیت کے بارے میں اپنی تحریر کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ خداوند عالم جس شخص کی اطاعت کو قطعی طور پر بے چون و چراں لازم قرار دے یقیناً اسے معصوم ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ معصوم عن الخطا نہ ہوگا تو وہ خطا کرے گا اور خدا تعالیٰ نے اس کی اطاعت لازم قرار دی ہے اور اس کی پیروری خطا کے باوجود ضروری سمجھی ہے تو اس سے خود حکم خداوند عالم میں تضاد پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس عمل کا کرنا حرام ہے اور دوسری طرف اولوا الامر کی اطاعت واجب ہے۔ اس طرح یہ حکمِ خدا امر و نہی کے اجتماع کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو خداوند عالم نے اولوا الامر کے حکم کی اطاعت کسی شرط اور پابندی کے بغیر واجب قرار دی ہے۔ دوسری طرف اگر اولوا الامر معصوم نہ ہو تو اس قسم کا حکم از روئے عقل سلیم صحیح نہیں ہے۔ اس مقدمہ اور تمہید سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں جن اولوا الامر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے انہیں یقیناً معصوم ہونا چاہیے۔ [1]

فخر الدین الرازی اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معصوم یا تو تمام امت ہے یا اس میں سے چند لوگ۔ یہ دوسرے معنی بھی قابل قبول نہیں ہیں کیونکہ ضروری ہے کہ ہم ان چند لوگوں کو پہچانیں اور ان تک پہنچ سکتے ہوں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ جب یہ

[1] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی جلد 10 صفحہ 144، طبع مصر 1357

احتمال یا شک دور ہو جاتا ہے تو پہلا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ تمام امت معصوم ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اجماع واتفاق امت حجت اور قابل قبول ہے اور یہ معتبر اور قابل اعتماد دلائل میں شمار کیا جاتا ہے۔[1]

ہم دیکھ رہے ہیں کہ فخر الدین رازی نے اس آیت کی اس دلالت کو کہ امام معصوم ہونا چاہیے بسر وچشم قبول کیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ یہ لکھنے پر بھی مجبور ہو گئے کہ اولوا الامر تمام امت یا مسلمانوں کے تمام طبقات کے نمائندوں کو قرار دیں حالانکہ یہ معنی کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ اولوا الامر تو وہ ہو گا جو اسلامی معاشرے کا رہبر ہو تا کہ اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی گوناگوں مشکلات اس کی تدبیر سے حل ہوتی رہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام آراء پر حکومت یہاں تک کہ اس کے نمائندوں کا بھی عملی طور پر اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ مختلف اجتماعی، سیاسی، ثقافتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل جن سے مسلمانوں کو سابقہ پڑتا ہے ان میں اکثر اوقات تمام امت کا یا ان کے نمائندوں کے اتفاق رائے کا حصول ممکن نہیں ہے اور اکثریت کی پیروی اولوا الامر کی پیروی نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس بناء پر فخر الدین رازی اور ہمارے معاصر علماء جو اس کے عقیدے کے پیرو ہیں ان کی گفتگو کا عملی مقصد یہ ہے کہ اولوا الامر کی اطاعت عملاً معطل رہے یا ایک استثنائی حیثیت سے باقی رہے۔

ہم مندرجہ بالا تمام بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ صرف اور صرف معصومؑ پیشواؤں کی رہبری ثابت کرتی ہے جو امت کی چند خاص ہستیوں پر مشتمل ہیں۔

---

[1] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی جلد 10 صفحہ 144)

چند اعتراضات:

اس موقع پر مندرجہ بالا تفسیر پر کچھ اعتراضات ہوئے ہیں ۔ بحث میں غیر جانبداری کا خیال رکھتے ہوئے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

1. اگر اولوا الامر سے مراد معصوم امام ہیں تو یہ مفہوم لفظ (اولی) کے ساتھ جو جمع ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ اس مفہوم کی صورت میں ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہیں ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ یہ ممکن ہے کہ ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہ ہوں لیکن وہ تمام زمانوں میں بہت سے افراد کی تشکیلِ سیرت اور تعمیرِ کردار کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت ایک زمانے کی ذمہ داری کا تعین نہیں کر رہی ہے۔

2. جب اولوا الامر پیغمبرؐ کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا تو اس صورت میں اس کی اطاعت کا حکم کس طرح دیا گیا ہے؟

اس کا جواب بھی گزشتہ جواب سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ آیت کسی معین زمانے کے لیے محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے فرائض کو ہر زمانے کے لیے واضح کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں حضورؐ خود اولوا الامر تھے کیونکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو منصب رکھتے تھے۔ ایک منصب رسالت اور تبلیغ احکام جو آیت میں **اطیعوا الرسول** کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا منصب امت اسلامی کی رہبری اور سربراہی جس کا ذکر قرآن نے اولوا الامر کے نام سے کیا ہے۔ اس لیے پیغمبرؐ کے زمانے میں خود پیغمبرؐ معصوم رہبر و پیشوا تھے اور شاید لفظ "**اطیعوا**" کا عدم تکرار رسولؐ اور اولوا الامر کے درمیان اسی معنی کی طرف اشارے سے خالی نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں منصب رسالت اور منصب اولوا الامر مختلف منصب ہیں جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود میں ایک جگہ جمع ہیں لیکن یہ امام میں جا کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور امام صرف دوسرا (اولوا الامر کا) منصب رکھتے ہیں۔

3. اگر واقعی اولوا الامر سے مراد معصوم امام اور رہبر ہیں تو پھر کیوں مسلمانوں کے اختلاف اور جھگڑے کو بیان کرتے ہوئے خدا کہتا ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا. اگر کسی چیز میں اختلاف پڑ جائے تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اولوا الامر کا ذکر نہیں ہے اور اختلاف کو دور کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ خدا کی کتاب اور حضرت رسول اکرمؐ کی سنت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف شیعہ علماء کی تفسیر پر نہیں ہے بلکہ تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفاسیر پر بھی اس کی زد پڑتی ہے یعنی یہ اعتراض اہل سنت کی تفاسیر پر بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا جملے میں اختلاف وتنازع سے مراد احکام میں اختلاف ہے نہ کہ ان مسائل سے جن کا تعلق حکومت ورہبری کی جزئیات سے ہے کیونکہ ان مسائل میں تو لازماً اولوا الامر کی اطاعت کرنا ہوگی جیسا کہ آیت کے پہلے جملے میں وضاحت ہو چکی ہے۔

اس بنا پر اس اختلاف سے مراد اسلام کے احکام اور قوانین کلی کا اختلاف ہے جن کی تشریع خدا اور پیغمبرؐ سے متعلق ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام احکام جاری کرنے والے

ہیں نہ کہ قانون وضع کرنے اور منسوخ کرنے والے۔ امام تو ہمیشہ خدا کے احکام اور سنت رسولؐ کے اجرا کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اسی لیے احادیث اہل بیتؑ میں ہے کہ اگر ہم میں کوئی شخص کتاب خدا اور حدیث پیغمبرؐ کے خلاف نقل کرے تو اسے ہرگز قبول نہ کرو کیونکہ یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ کے خلاف کچھ کہیں۔ اسی لیے احکام وقوانین اسلامی میں لوگوں کے اختلافات دور کرنے کا پہلا مرجع خدا اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر وحی خدا نازل ہوتی ہے۔ جو کچھ آئمہ معصومینؑ بیان کرتے ہیں وہ ان کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ وہ وہی ہے جو کتاب خدا یا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوا الامر کا لفظ اختلافی احکام و مسائل کے حل کرنے والوں میں شامل نہیں ہے۔

اگر سورۃ النساء کی آیت 83 وَ اِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ط [1]

میں بعض مشکلات کو حل کرنے کے لیے اولوا الامر کو مرجع قرار دیا گیا ہے تو اس سے مراد شریعت کے کلی احکام وقوانین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ ان مسائل کے بارے میں ہے جو احکام جاری کرنے کے طریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

[1] جب ان کے (مسلمانوں کے) پاس امن یا خوف کی خبر آئی تو اسے فوراً مشہور کر دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس خبر کو رسولؐ یا اپنے (ایمانداروں) میں سے صاحبان امر تک پہنچاتے تو بے شک جو لوگ ان میں سے اس کی تحقیق کرنے والے ہیں (پیغمبر یا اولی الامر) اس کو سمجھ لیتے (کہ مشہور کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں

احادیث کی گواہی:

اسلامی کتب اور مصادر میں اکثر احادیث موجود ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ لفظ اولوا الامر سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

1. مشہور اسلامی مفسر ابو حیان اندلیسی مغربی (متوفی 756ھ) تفسیر بحر المحیط جلد سوم صفحہ 278 میں لکھتا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور آئمہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

2. عالم اہل سنت ابو بکر بن مومن شیرازی رسالہ اعتقاد میں (مناقب کاشی کے مطابق) ابن عباسؓ سے نقل کرتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں جنگ تبوک کے موقع پر اپنی جگہ مدینہ منورہ میں چھوڑتے ہوئے فرمایا تھا:

" اَمَّا تَرضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّی بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی حِیْنَ قَالَ اَخْلِفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ فَقَالَ عَزَّ وَ جَلَّ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ "

" کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی جبکہ موسیٰؑ نے ان سے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کرو اس کے بعد خداوند عالم نے فرمایا: " واولی الامر منکم "۔ (احقاق الحق جلد 3 صفحہ 478)

3۔ شیخ سلیمان حنفی قندوزی جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں ینابیع المودۃ میں کتاب مناقب میں سلیم بن قیس حلالی سے نقل کرتے ہیں:

ایک دن ایک شخص حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا: کم از کم وہ کون سی چیز ہے جس کے ذریعے انسان مومن کی صف میں شامل ہو سکتا ہے اور کم از کم وہ کون سی چیز ہے جس سے انسان کافروں یا گمراہ لوگوں میں شمار ہو جاتا ہے۔ حضرت

امیر المومنینؑ نے فرمایا: کم از کم وہ چیز جس کی وجہ سے انسان گمراہوں میں شامل ہو جاتا ہے یہ ہے کہ وہ خدا کی حجت اور نمائندے اور اس کے شاہد و گواہ کو جس کی اطاعت و ولایت ضروری ہے نہ پہچانے۔ اس شخص نے کہا: اے امیر المومنینؑ! مجھے ان کا تعارف کرائیے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: وہ وہی ہیں جنہیں خدا نے اپنے پیغمبرؐ کے برابر قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔

اس شخص نے عرض کیا: میں آپ پر قربان جاؤں مزید وضاحت فرمایئے۔

امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا: جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف موقعوں پر اور اپنی زندگی کے آخری دن کے خطبہ میں تذکرہ کیا اور فرمایا:

اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ عَنْ
تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ

میں تمہارے درمیان دو چیزیں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں اگر تم ان کا دامن مضبوطی سے تھام لوگے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے خدا کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ (ینابیع المودة طبع استنبول صفحہ 116)

4. نیز یہی عالم کتاب "ینابیع المودة" میں لکھتے ہیں کہ صاحب کتاب مناقب نے تفسیر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی (ینابیع المودة صفحہ 114 طبع استمبول)

5. شیعہ کتب کی متعدد روایات جو کافی، تفسیر عیاشی کتب صدوق وغیرہ میں منقول ہیں سب کی سب یہ گواہی دیتی ہیں کہ اولوا الامر سے مراد آئمہ معصومینؑ ہیں۔ یہاں تک کہ بعض میں تو ہر ایک امام کا نام صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

جیسا کہ تفسیر برہان میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے مروی ہے جب یہ آیت

اطیعوا اللہ.... نازل ہوئی تو میں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے اللہ اوراس کے رسولؐ کو جان لیا لیکن یہ فرمایئے کہ وہ اولوالامر کون ہے؟ جن کی اطاعت آپؐ کی اطاعت کے ساتھ ملی ہوئی ہے تو آپؐ نے فرمایا: اے جابرؓ وہ میرے خلفاء ہیں جو میرے بعد مسلمانوں کے امام ہوں گے۔ان میں پہلا علی ابن ابی طالبؑ ہے پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علی بن الحسینؑ پھر محمد بن علیؑ جو تورات میں باقر کے لقب سے معروف ہے۔اے جابرؓ تو اس کی زیارت کرے گا جب ان سے ملنا تو میرا اسلام ان کو پہنچانا۔پھر جعفر بن محمد صادقؑ پھر موسیٰ بن جعفرؑ پھر علی بن موسیٰؑ پھر محمد بن علیؑ پھر علی بن محمدؑ پھر حسن بن علیؑ پھر میرا ہم نام اور ہم کنیت ہوگا زمین پر حجۃ اللہ اور مخلوق میں بقیۃ اللہ ہوگا حسن بن علیؑ کا فرزند ہوگا۔ اس کے ہاتھوں پر خدا مغرب و مشرق کی فتح نصیب کرے گا جو کافی عرصہ اپنے شیعوں اور دوستوں سے غائب ہوگا اور اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کی امامت کے اقرار پر وہی ثابت قدم رہے گا جس کا دل ایمان کے لئے امتحان کی کسوٹی سے پورا اترے گا۔جابرؓ کہتے ہیں میں نے عرض کی حضورؐ اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کے وجود سے شیعوں کو کچھ فائدہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں جس نے مجھے برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اس کی قسم شیعہ اس کے نور سے روشن ہوں گے اور اس کی ولایت سے نفع مند ہوں گے جس طرح سورج بادل میں آکر مخلوق خدا کو نفع پہنچایا کرتا ہے۔

نیز ابوبصیر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی آیت مجیدہ کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا یہ آیت حضرت علی اور امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کے حق میں اتری ہے تو میں نے عرض کی حضور لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیتؑ کا نام کیوں نہیں لیا۔آپؑ نے فرمایا: خدا نے نماز کا حکم دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کی رکعتیں تین ہیں یا چار۔پس جناب رسالت مآبؐ نے ہی تفصیل

بیان فرمائی ہے۔اسی طرح زکوٰۃ کا حکم خدا نے دیا اور یہ نہیں کہا کہ چالیس درہموں میں سے ایک دیا جائے تو رسالت مآبؐ نے تفصیل بیان کی۔اسی طرح اطیعوا اللہ ... اتری اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: یہ علی اور حسن اور حسین علیہم السلام کے حق میں ہے۔حضرت علی علیہ السلام کے متعلق فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اور نیز فرمایا: میں تم کو کتاب خدا اور اہل بیتؑ کی وصیت کرتا ہوں اور خدا نے میری دعا کو مستجاب فرمایا پس یہ دونوں جدا نہ ہوں گے اور تمہیں حوض کوثر تک میرے پاس پہنچائیں گے پس تم لوگ ان کو مت سکھانا یہ تم سے اعلم (زیادہ علم والے) ہیں اور یہ تمہیں کبھی ہدایت سے گمراہی کی طرف نہ لے جائیں گے اور پھر حدیث کساء کے ذریعے سے آپؐ نے اہل بیتؑ کا بھی تعین فرما دیا تاکہ آل فلاں اور آل فلاں اہل بیت ہونے کا دعویٰ نہ کر دیں۔چنانچہ آیت تطہیر اہل بیتؑ کی عصمت پر بطور نص نازل ہوئی۔پس حضرت علی علیہ السلام سب سے اولیٰ تھے اور ان کے بعد حضرت امام حسن اور پھر امام حسین علیہم السلام اور ان کے بعد ان کی اولاد یکے بعد دیگرے اور اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ کی تاویل جاری رہی۔حدیث طویل تھی میں نے اختصار کے پیش نظر اس کا خلاصہ عرض کر دیا ہے اسی مضمون کی احادیث بکثرت موجود ہیں۔

یہاں تک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اولوا الامر سے مراد حضرت علی علیہ السلام اور اس کی عترت طاہرہ ہے جو یکے بعد دیگرے عہدہ امامت پر فائز ہیں اور سب کے سب گناہان صغیرہ و کبیرہ سے پاک و معصوم ہیں۔اور اس وقت اس آیت مجیدہ کا مصداق حضرت ولی العصر صاحب الزمانؑ (عج) موجود ہیں جو ہماری آنکھوں سے غائب ہیں۔جب اللہ کا حکم ہوگا ظہور فرمائیں گے۔دنیا کو عدل وانصاف سے پر کر دیں گے جس طرح کہ ظلم و ستم سے پر ہو چکی ہے۔اللھم عجل فرجہ واجعلنا من انصارہ.

خلاصہ

(اطبعوا اللہ) اللہ بالذات واجب الاطاعت ہے۔ (واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم) پیغمبرؐ اور اولوالامر بالغیر واجب الاطاعت ہیں۔

اولوالامر کون ہیں؟

اس بارے میں مفسرین اسلام میں بہت اختلاف ہے :

1. اولوالامر سے مراد بادشاہ وقت اور صاحبان اقتدار۔

2. عام طبقات کے نمائندے، سربراہ، حکام، علماء اور کوائفِ زندگی کے تمام عہدے دار اگر ان کے احکام اسلام کے مقرر کردہ احکام کے خلاف نہ ہوں۔

3. معنوی اور فکری رہنما (علماء) جو عادل ہوں اور کتاب وسنت سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں

4. صرف پہلے چار خلفاء۔ 5. اصحاب پیغمبرؐ ۔

6. اسلامی لشکروں کے سپہ سالار۔ 7. آئمہ معصومینؑ۔

پہلی تفسیر کسی طرح بھی آیت کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہر حکومت کی اطاعت و پیروری کسی قید و شرط کے بغیر خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی طرح کیسے ہوسکتی ہے۔ دوسری اور تیسری تفسیر میں یہ سقم (عیب) ہے کہ عام طبقات کے نمائندوں، سربراہان، حکام، علماء، عہدے داران اور معنوی وفکری رہنماؤں کے احکام کے اسلامی ہونے کا تعین

کون کرے گا۔ چوتھی تفسیر کو پہلے چار خلفا تک محدود کردینے کا مفہوم یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں لفظ اولوا الامر کا کوئی مصداق نہیں ہے۔ پانچویں اور چھٹی تفسیر میں اس کو صحابہؓ یا افسران لشکر کے ساتھ مخصوص کرنا اس پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

واحد تفسیر جو مذکورہ اعتراضات کی زد میں نہیں آسکتی وہ ساتویں تفسیر ہی ہے یعنی اولوالامر سے مراد معصوم، رہبر اور آئمہؑ ہیں۔ کیونکہ مقام "عصمت" امام کی ہر خطا اور گناہ سے محفوظ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر حکم فرمان پیغمبرؐ کی طرح کسی قید و شرط کے بغیر واجب الاطاعت ہے۔

ایک قابل توجہ بات:

فخر الدین رازی نے اس آیت کی اس دلالت کو کہ امام معصوم ہونا چاہیے خوشی سے قبول کیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ یہ لکھنے پر بھی مجبور ہوگئے کہ اولوا الامر تمام امت یا مسلمانوں کے تمام طبقات کے نمائندوں کو قرار دیں حالانکہ یہ معنی کسی طرح بھی قابل قبول نہیں کیونکہ تمام امت یا ان کے نمائندوں کے اتفاق رائے کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔

چند اعتراضات:

1. اولوا الامر سے مراد معصوم امام ہیں تو یہ مفہوم لفظ (اولی) کے ساتھ جو جمع ہے اس طرح مناسبت رکھتا ہے کہ آیت کسی معین زمانے کے لیے محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے فرائض کو ہر زمانے کے لیے واضح کر رہی ہے۔

2. عہد رسالت میں حضورؐ خود اولوا الامر تھے کیونکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو منصب رکھتے تھے۔ ایک منصب رسالت اور تبلیغ احکام جو آیت میں

اطیعوا الرسول کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔دوسرا منصب امت اسلامی کی رہبری اور سربراہی جس کا ذکر قرآن نے اولوا الامر کے نام سے کیا ہے۔لیکن یہ دونوں مناصب امام میں جا کر الگ الگ ہو جاتے ہیں اور امام صرف دوسرا (اولوا الامر کا) منصب رکھتے ہیں تو یہ اعتراض کہ جب اولوا الامر پیغمبرؐ کے زمانے میں موجود ہی نہیں تھا تو اس صورت میں اس کی اطاعت کا حکم کس طرح دیا گیا ہے رفع ہو جاتا ہے۔

3. آیت کے اس جملے " فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول" میں اختلاف وتنازع سے مراد اسلام کے احکام اور قوانین کلی میں اختلاف ہے نہ کہ ان مسائل سے جن کا تعلق حکومت ورہبری کی جزئیات سے ہے۔ہم جانتے ہیں کہ امام احکام جاری کرنے والے ہیں نہ کہ قانون وضع کرنے اور منسوخ کرنے والے۔ امام تو ہمیشہ خدا کے احکام اور سنت رسولؐ کے اجرا کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔

احادیث کی گواہی:

اسلامی کتب اور مصادر میں اکثر احادیث موجود ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ لفظ اولوا الامر سے مراد آئمہ اہل بیتؑ ہی ہیں۔

خود آزمائی

1. اولوالامر کے تعین کے سلسلے میں مفسرین کیا اختلافات رکھتے ہیں بیان کریں؟
2. دلائل سے ثابت کریں کہ اولوالامر کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟
3. کیا اہل سنت کے مشہور مفسر فخر الدین رازی امام کو معصوم سمجھتے ہیں؟
4. رسالت مآبؐ کے زمانے میں اولوالامر کون تھے؟
5. احادیث کی روشنی میں واضح کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کن ہستیوں کو اولوالامر قرار دیا ؟
6. وضاحت کریں کہ :

خدا بالذات واجب الاطاعت ہے اور پیغمبرؐ بالغیر واجب الاطاعت ہیں۔

7. اس زمانے میں اولوالامر کون ہیں ؟

9

آیت بیّنۃ

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ
شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّ
رَحۡمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ
بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ج فَلَا
تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ ق اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ
وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝

(سورۃ ھود 11 آیت 17 پارہ 12)

ترجمہ: تو کیا جو شخص اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہو اور اس کے پیچھے ہی پیچھے انہی کا ایک گواہ ہو اور اس کے قبل موسیٰؑ کی کتاب (تورات) جو (لوگوں کے لیے) پیشوا اور رحمت تھی۔ (اس کی تصدیق کرتی ہو وہ بہتر ہے یا کوئی دوسرا) یہی لوگ سچے ایمان والے اور تمام فرقوں سے جو شخص اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا بس آتش (جہنم) ہے تو تم کہیں اس کی طرف سے شک میں نہ پڑے رہنا۔ بے شک یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر

زیرنظر آیت کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ آیت کے الفاظ کی جزئیات، ضمائر، موصول اور اسم اشارہ کے بارے میں مختلف نظریے ہیں۔اس تفسیر میں ان سب کا ذکر ہمارے طریقۂ تفسیر کے خلاف ہے۔دو تفاسیر جو زیادہ واضح معلوم ہوتی ہیں۔اہمیتِ ترتیبی کے اعتبار سے یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

(1) آیت کی ابتداء میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اور اس کے پیچھے خدا کی طرف سے شاہد آیا ہے اور اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب (تورات) پیشوا، رحمت اور ان کی عظمت کو واضح کرنے والی کتاب کی حیثیت سے آئی ہے۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ط۔ اس شخص کی طرح ہے جو ان صفات، نشانیوں اور واضح دلائل کا حامل نہیں ہے۔

یہ شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہیں۔ان کی واضح دلیل قرآن مجید ہے۔ان کی نبوت کی صداقت کا شاہد حضرت علی علیہ السلام جیسا مومن صادق ہے اور اس سے پہلے ان کی نشانیاں اور صفات تورات میں آچکی ہیں۔اس طرح تین واضح طریقوں سے آپؐ

کی دعوت کی حقانیت ثابت ہوگئی ہے۔

پہلا راستہ: قرآن ہے۔جو ان کے ہاتھ میں واضح دلیل ہے۔

دوسرا راستہ: گزشتہ آسمانی کتب ہیں۔جن میں آنحضرتؐ کی نشانیاں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانے کے ان کتب کے پیروکار انہیں اچھی طرح سے پہچانتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے انتظار میں تھے۔

تیسرا راستہ: آپؐ کے فداکار پیروکار اور مخلص مومنین ہیں جو آپؐ کی دعوت اور گفتار کی صداقت کو واضح کرتے تھے کیونکہ کسی مکتب کی حقانیت کی ایک نشانی اس مکتب کے پیروکاروں کا اخلاص، جان نثاری، دانشمندی اور ایمان ہے اور ہر مکتب کو اس کے پیروکاروں سے پہچانا جاتا ہے۔

کیا ان زندہ دلائل و براہین کے باوجود انہیں دوسرے مدعیان نبوت پر قیاس کیا جا سکتا ہے یا ان کی دعوت کی صداقت میں شک وشبہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

اس گفتگو کے بعد قرآن متلاشیان حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ضمنی طور پر ایمان کی دعوت دیتا ہے ایسے پیغمبر پر جو ایسی روشن دلیل رکھتا ہے ایمان لائیں گے **اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ**

لفظ "**اُولٰٓئِکَ**"، میں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ ان کا ذکر نہیں ہے لیکن گزشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس آیت میں ان کی موجودگی کا احساس

[1] اس تفسیر کے مطابق مَنْ سے مراد پیغمبر اکرمؐ ہیں بینہ سے مراد قرآن سے اور شاہد سے جو کہ جنس کے معنی میں ہے سے مراد سچے مومنین ہیں جن کے رئاس ورئیس حضرت علیؑ ہیں نیز مَنْ کی ضمیر خدا تعالی کی طرف اور قبلہ کی ضمیر قرآن یا پیغمبر اسلام کی طرف لوٹتی ہے۔ پورا جملہ مبتدا اس کی خبر محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہوگی "کمن لیس کذالک" یا "کمن یرید الحیاۃ الدنیا"

ہوتا ہے اوران کی طرف اشارے کومحسوس کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد منکرین کی کہانی یوں بیان کی گئی ہے۔مختلف گروہوں میں سے جوکوئی اس سے کفر کرے گا تواس کی وعدہ گاہ جہنم ہے وَمَنْ یَّکْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ

آیت کے آخر میں قرآن کے دیگر بہت سے مواقع کی طرح سیرت قرآن کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے تمام لوگوں کے لیے ایک عمومی درس بیان کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: اب جبکہ ایسا ہے اور تیری دعوت کی صداقت کے لیے یہ تمام شاہد موجود ہیں جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے اس کے بارے میں ہرگز کسی شک وشبہ کوراہ نہ دے فلا تک فی مریة منه کیونکہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے کلام حق ہے اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ لیکن بہت سے لوگ جہالت،تعصب اور خود پسندی کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

(2) دوسری تفسیر جو آیت کے لیے ذکر ہوئی ہے یہ ہے کہ اصل مقصد سچے مومنین کی حالت بیان کرنا ہے۔وہ ان واضح دلائل وشواہد اور گزشتہ کتب میں موجود شہادتوں کی بنیاد پر دعوت پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی صداقت پر ایمان لائے ہیں۔ لہٰذا " اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ " کے جملے سے مراد وہ تمام لوگ ہیں کہ جو کھلی آنکھوں اور اطمینان بخش دلائل کے ذریعے اور اس کے لانے والے کی پیروی کررہے ہیں اور اس سے مراد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نہیں ہیں۔

یہ تفسیر گزشتہ تفسیر پر یہ ترجیح رکھتی ہے کہ مبتداء کی خبر آیت میں صراحت سے آئی ہے۔اس میں کوئی محذوف نہیں اور "اولئک" کا مشارالیہ خود آیت میں مذکور ہے۔نیز آیت کا پہلا حصہ جو " اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ " سے شروع ہوتا ہے۔

أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ تک ایک مکمل جملہ ہے اور اس میں کوئی حذف وتقدیر نہیں ہے۔

بلاشبہ آیت کی دوسری تعبیریں اس تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتیں اس لیے ہم نے اس تفسیر کو دوسرے مرحلے میں قرار دیا ہے۔

بہر حال آیت اسلام اور سچے مسلمانوں کے امتیازات اور اس مکتب کے انتخاب میں محکم دلائل پر ان کے اعتماد کرنے کی طرف اشارہ ہے جبکہ دوسری طرف سے آیت متکبر منکرین کا انجام بد بیان کر رہی ہے۔

چند اہم نکات

1۔ آیت میں "شاہد" سے مراد:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں "شاھد" سے مراد وحی خدا کے قاصد جبرائیلؑ ہیں۔

بعض نے اس سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم لیے ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین نے اس کی تفسیر زبان پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ہے جبکہ "يَتْلُوهُ" کو "تلاوت" کے مادہ سے "قرأة" کے معنی میں لیا ہے نہ کہ پیچھے آنے والا۔

لیکن بہت سے بزرگ مفسرین نے اسے حضرت علی علیہ السلام سے تعبیر کیا ہے۔

اس ضمن میں آئمہ معصومینؑ سے بھی کئی ایک روایات ہم تک پہنچی ہیں اور اہل سنت کی بعض کتب تفسیر میں اس کی تائید موجود ہے۔ ان روایات سے اس تفسیر کی تاکید ہوتی ہے

کہ "شاھد" سے مراد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے والے پہلے شخص ہیں جو تمام مراحل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی جان نثاری سے دریغ نہیں کیا اور آخری دم تک ان کی حمایت میں کوشاں رہے۔[1]

"شَاھِدٌ مِنْہ" یعنی وہ شاہد جو صاحبِ بیّنہ میں سے ہو۔ تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس آیت میں شاہد سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور علامہ حلیؒ نے ذکر کیا ہے کہ جمہور نے یعنی اہل سنت نے بھی اس مقام پر شاہد سے مراد حضرت علی علیہ السلام کو لیا ہے۔ لہٰذا یہ آیت مجیدہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر نص ہے اور فضل بن روز بہان نے اہل سنت کی تفسیروں میں اس حوالہ کا موجود ہونا تسلیم نہیں کیا لیکن دلائل الصدق جلد 2 صفحہ 160 میں اسے تفاسیر اہل سنت سے ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ فخر الدین الرازی نے اپنی تفسیر کبیر میں "شاھد" کے معنی کے متعلق چند وجوہ[2] ذکر کیے ہیں۔ تیسری وجہ یہ بیان کی کہ اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور ضمیر غائب کا مرجع بینہ بتاویل برہان ہے اور وہ اس بینہ کی تلاوت کرتے ہیں (اور منہ میں ضمیر غائب کا مرجع من ہے) یعنی وہ شاہد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے اور اس کی جز ہے اور اس میں شاہد کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی جز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: قریش کے مشہور افراد کے بارے میں ایک یا ایک سے زیادہ آیات نازل ہوئیں کسی نے عرض کیا: اے امیر المومنینؑ! آپ کے بارے میں کونسی آیت نازل ہوئی۔ امامؑ نے فرمایا: کیا تو نے سورہ

[1] برہان، نور الثقلین، قرطبی، مجمع البیان اور دیگر تفاسیر کی طرف رجوع کریں۔ [2] وجہ کی جمع ہے۔

ہود کی یہ آیت نہیں پڑھی۔ اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ وَیَتْلُوْہُ شَاہِدٌ مِّنْہُ رسولؐ اللہ خدائی بینۃ رکھتے تھے اور ''شاھد'' میں تھا۔ (تفسیر برہان جلد2 صفحہ213)

اسی طرح طبری سے بھی منقول ہے اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ آیت چار وجوہ کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر دلالت کرتی ہے۔

اوّل: آیت مجیدہ میں حضرت علی علیہ السلام کو شاہد کہا گیا ہے اور شاہد سے مراد امت پر شاہد ہونا ہے۔ اس قرینہ سے کہ آپ رسولؐ کے تالی (بلا فصل پیچھے چلنے والے) ہیں جس طرح حضورؐ کو ایک مقام پر شاہد کہا گیا ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا یعنی اے رسولؐ ہم نے تم کو تمام عالم کا شاہد (گواہ) اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سورہ فتح48 آیت8) اور باقی انبیا کے مطلق کہا گیا ہے: وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیْدًا عَلَیْہِمْ مِّنْ اَنْفُسِہِمْ وَجِئْنَا بِکَ شَہِیْدًا عَلٰی ہٰٓؤُلَآءِ یعنی اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امّت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے اور اے پیغمبرؐ تم کو ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔ (سورۃ النحل16 آیت89) اس سے لوگوں کے امور میں ولایت وحکومت شرعی ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام کو شاہد کہنا لوگوں کے امور پر اس کی ولایت کو ثابت کرتا ہے اور یہی خلافت کا مفہوم ہے۔

دوم: آیت مجیدہ میں حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا بعض کہا گیا کہ شاہد اس سے ہے جیسے خود پیغمبرؐ نے بھی اس کی تائید اپنے الفاظ میں یوں فرمائی (علی منی وانا منہ علیؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں) اور یہ چیز عصمت، فضل اور تمام صفات حمیدہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کی مشارکت کو ثابت کرتی ہے پس حضرت علی علیہ السلام ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خلافت کے حق دار ثابت ہوتے ہیں۔

سوم: آیت مجیدہ میں حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا تالی کہا گیا ہے جیسا کہ ضمیر مذکر کے مرجع کے ساتھ مطابق ہونے کا تقاضا ہے اور تالی ہونے سے مراد بلافصل پیچھے چلنا ہے اور اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

(i) وہ ان کے قائم مقام ہوں۔

(ii) وہ ان کی طرح بینہ پر ہوں۔

(iii) وہ ان کی دعوت میں معاون و مددگار رہوں۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے خود فرمایا: میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ میری کمر کو حضرت علی علیہ السلام کی مدد سے مضبوط کرے اور حضرت علی علیہ السلام کو میرا شریک کار بنائے اور خدا نے ان کی دعا کو مستجاب فرمایا پس حضرت علی علیہ السلام کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ایسی ہے جیسی ہارونؑ کی موسیٰؑ سے تھی۔

پس پہلی صورت میں خلافت ثابت ہوگئی اور دوسری صورت میں جب حضرت علی علیہ السلام رسولؐ کی طرح بینہ پر ہیں تو اس کا لازمی مطلب اور نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بعد ان کے قائم مقام بھی یہی ہوں گے۔ تیسری صورت میں جب نصِ قرآن سے حضرت علی علیہ السلام ہی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مشن میں ان کے ناصر و معاون ہیں جیسے موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے تو دوسروں سے صفت میں اولیٰ ثابت ہو گئے۔

چہارم: اگر یہ کہا جائے کہ ضمیر کا مرجع بینہ ہے جیسے گزر چکا ہے تو مقصد یہ ہوگا کہ حضرت علی علیہ السلام ہی وہ ذات ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی شہادت قرآن مجید سے فرماتے تھے تو ان کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا دوسرا معجزہ قرار دیا گیا ان کا پہلا معجزہ ہے بینہ اور دوسرا معجزہ وہ شاہد ہے جو بینہ کی تلاوت کرتا ہے۔ پس یہی حضرت علی علیہ السلام کی تمام صحابہؓ سے افضل ہونے کی دلیل ہے لہٰذا جو تمام صحابہؓ سے افضل

ہوگا وہی رسولؐ کی خلافت کا مستحق ہوگا۔ (دلائل الصدق)

" اماما ورحمة " ان کو کتابِ موسیٰؑ سے حال قرار دیا گیا ہے اور معنی یہ کہ کتابِ موسیٰؑ امام ورحمت تھی اور ممکن ہے کہ موسیٰ سے حال ہوں اور معنی یہ ہو کہ حضرت موسیٰؑ اپنی امت کے لئے امام اور باعث رحمت تھے اور حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد تورات کی شہادت کو تائید کے لئے پیش کیا گیا یعنی رسولؐ کے شاہد ہونے میں حضرت علی علیہ السلام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور حضرت موسیٰؑ کی کتاب کی شہادت کو تائید کے لئے پیش کیا گیا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صادق برحق ہونے کے شاہد تورات کے وہ بیانات ہیں جن میں حضرت موسیٰؑ کو حضورؐ کی آمد کی خبر دی گئی تھی اور موسیٰؑ نے امت کو پیشین گوئی کی تھی۔ چنانچہ جن یہودیوں نے اسلام کو قبول کیا تھا اس کی زیادہ تر وجہ تورات کی پیشین گوئیاں تھیں جن میں حضرت رسالت مآبؐ کے اوصاف تک درج تھے۔

"الاحزاب" اس جگہ احزاب سے مراد مشرکین مکہ اور یہود ونصاریٰ ہیں چنانچہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ لوگوں میں سے جس کے کانوں میں میری دعوت پہنچے گی اور وہ ایمان نہ لائے گا خواہ یہودی ہو یا نصرانی تو وہ اصحاب النار سے ہوگا۔ احزاب جمع ہے حزب کی۔

" فلا تک فی مریة " یہ بھی خطاب حضورؐ کی طرف ہے اور مراد ساری امت ہے۔

تفسیر جامع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ خدا نے لوگوں پر پانچ چیزیں واجب کی تھیں انہوں نے چار کو لے لیا اور پانچویں کو چھوڑ دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا وہ کون سی ہیں؟ تو آپؑ نے فرمایا نماز، روزہ، حج، زکوۃ لیکن وہ پانچویں جس کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے وہ ہے ولایت حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام۔ صحابہؓ نے عرض کی حضور حضرت علی

علیہ السلام کی ولایت خداوند کریم کی جانب سے ہے تو آپؐ نے فرمایا ہاں اور پھر اس سے اگلی آیت آپؐ نے تلاوت فرمائی۔ بہر کیف روایات کے خاصہ و عامہ سے ثابت ہے کہ یہاں شاہد سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں پس آیہ مجیدہ آپؐ کی خلافت پر نص (حکم قطعی) ہے۔

سورہ رعد کی آخری آیت میں بھی ایک تعبیر دکھائی دیتی ہے جو اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے: " وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ " کفار کہتے ہیں کہ تو پیغمبرؐ نہیں ہے کہہ دو یہی کافی ہے کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور وہ جس کے پاس علم کتاب (قرآن) ہے۔ سُنی اور شیعہ طرق کی بہت سی روایات میں ہے کہ " مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

اس مطلب کی طرف اشارہ بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ لفظ " شاھد " سے حضرت علی علیہ السلام مراد لینا اس حقیقت کے منافی نہیں کہ ابوذرؓ، سلمانؓ، عمار یاسرؓ جیسے تمام افراد اس کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ ایسی تفاسیر اکمل و برتر فرد کی طرف اشارہ ہوتی ہیں یعنی اس سے مراد جن کے رئیس یہ فرد اکمل ہے۔ اس امر کی شاہد وہ روایت ہے جو حضرت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "شاہد سے مراد امیر المومنینؑ ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے ان کے جانشین۔" (تفسیر برہان جلد 2 صفحہ 213)

اس حدیث میں اگر چہ معصوم ہستیوں کا ذکر ہے لیکن یہ امر خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ روایات جن میں " شاھد " کو صرف حضرت علی علیہ السلام سے تفسیر کیا گیا ہے ان سے مراد فقط آپؐ نہیں بلکہ مراد افضل و برتر کا مصداق ہے۔

صرف تورات کی طرف اشارہ کیوں؟

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حقانیت کی ایک دلیل زیر بحث آیت میں گزشتہ کتب بیان کی گئی ہیں لیکن تذکرہ صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا ہوا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ظہور کی بشارتیں انجیل میں بھی ہیں۔شاید یہ اس بنا پر ہو کہ نزول قرآن اور ظہور اسلام کے علاقے یعنی مکہ اور مدینہ میں زیادہ تر اہل کتاب میں سے یہودیوں کے افکار و نظریات پھیلے ہوئے تھے اور عیسائی نسبتاً دور کے علاقوں میں رہتے تھے مثلاً یمن، شامات اور نجران (جو شمالی یمن کے پہاڑی علاقوں میں صنعا سے دس منزل کے فاصلے پر واقع تھا) یا ہوسکتا ہے یہ اس بنا پر ہو کہ اوصاف پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا تذکرہ تورات میں زیادہ جامع اور وسیع طور پر آیا تھا۔

بہرحال تورات کے بارے میں ''امام'' کی تعبیر ہوسکتا ہے اس بنا پر ہو کہ شریعت موسیٰؑ کے احکام پورے طور پر اس میں موجود تھے۔ یہاں تک کہ عیسائی بھی اپنی بہت سی تعلیمات تورات سے لیتے ہیں۔

خلاصہ

مفسرین کے درمیان آیت کے الفاظ کی جزئیات، ضمائر، موصول اور اسم اشارہ کے بارے میں مختلف نظریے ہیں۔ دو تفاسیر یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

(1) اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ میں " مَنْ " سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہیں۔ ان کی واضح دلیل قرآن مجید ہے وَيَتْلُوْهُ [1] شَاهِدٌ مِّنْهُ میں "شَاهِدٌ" سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ اس سے قبل ان کی نشانیاں اور صفات تورات میں آ چکی ہیں۔

لفظ " اُولٰٓئِکَ " میں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ ان کا ذکر نہیں ہے لیکن گزشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس آیت میں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی طرف اشارے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

(2) " اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ " کے جملے میں " مَنْ " سے مراد پیغمبرؐ نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ ہیں جو آپؐ کی پیروی کر رہے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق مبتداء کی خبر آیت میں صراحت سے آئی ہے۔ اس میں کوئی محذوف نہیں اور "اولئک " کا مشارالیہ لفظ " مَنْ " ہے۔ نیز آیت کا پہلا حصہ جو "اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ " سے شروع ہوتا ہے۔ " اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ" تک ایک مکمل جملہ ہے اور اس میں کوئی حذف و تقدیر نہیں ہے۔

[1] یَتْلُوْهُ کو تلاوت کے مادہ سے قرأۃ کے معنی میں نہ کہ پیچھے آنے والا

آیت میں ''شاھد'' سے مراد:

(i) جبرائیلؑ (ii) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم

(iii) حضرت علی علیہ السلام (iv) زبانِ پیغمبرؐ

بہت سے بزرگ مفسرین اور اہل سنت کی بعض کتب تفسیر میں اس کی تائید موجود ہے کہ ''شاھد'' سے مراد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

''شَاھِدٌ مِنہ'' یعنی وہ شاہد جو صاحبِ بیّنہ میں سے ہو۔ فخر الدین الرازی نے اپنی تفسیر کبیر میں تیسری وجہ یہ بیان کی کہ اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور ضمیر غائب کا مرجع بینہ بتاویل برہان ہے اور وہ اس بینہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ ''مِنہ'' میں ضمیر غائب کا مرجع ''مَنْ'' ہے یعنی وہ شاہد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ہے اور اس میں شاہد کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی جز ہے۔

یہ آیت چار وجوہ کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر دلالت کرتی ہے:

1. آیت مجیدہ میں حضرت علی علیہ السلام کو شاہد کہا گیا ہے جس طرح حضورؐ شاہد ہیں (اِنَّـا اَرْسَلْنٰکَ شَـاهِدًا وَّمُبَشِّـرًاوَّنَذِیْـرًا) شاہد سے مراد امت پر شاہد ہونا ہے۔ لہٰذا حضرت علیؑ کو شاہد کہنا لوگوں کے امور پر اس کی ولایت کو ثابت کرتا ہے اور یہی خلافت کا مفہوم ہے۔

2. حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا بعض کہا گیا کہ شاہد اس سے ہے۔ خود پیغمبرؐ نے بھی تائید فرمائی علی منی وانا منہ یہ چیز تمام صفات میں رسولؐ اللہ کے ساتھ حضرت علیؑ کی مشارکت ثابت کرتی ہے پس حضرت علیؑ ہی رسولؐ اللہ کی خلافت کے حق دار ثابت ہوتے ہیں۔

3. آیت مجیدہ میں حضرت علیؑ کو تالی کہا گیا ہے جیسے کہ ضمیر مذکر کا مرجع کے ساتھ مطابق ہونے کا تقاضا ہے اور تالی ہونے سے مراد بلا فصل پیچھے چلنا ہے۔

4. اگر یہ کہا جائے کہ ضمیر کا مرجع بینہ ہے تو مقصد یہ ہوگا کہ حضرت علیؑ ہی وہ ذات ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی شہادت قرآن مجید سے فرماتے تھے۔ پس حضورؐ کا پہلا معجزہ بینہ ہے اور دوسرا معجزہ وہ شاہد ہے جو بینہ کی تلاوت کرتا ہے۔ لہذا جو تلاوت میں مقدم ہے وہی تمام صحابہؓ سے افضل اور آپؐ کے بعد خلافت کا حقدار ہے۔

"اماما ورحمة" کو کتابِ موسیٰؑ سے حال قرار دیا گیا ہے۔ جس کا معنی ہے کہ کتابِ موسیٰ امام ورحمت تھی اور ممکن ہے کہ موسیٰ سے حال ہوں اور معنی یہ ہو کہ حضرت موسیٰؑ اپنی امت کے لئے امام اور باعث رحمت تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد تورات کی شہادت کو تائید کے لئے پیش کیا گیا۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ نے امت کو حضورؐ کی آمد کی پیشین گوئی کی تھی۔

"الاحزاب" اس جگہ احزاب سے مراد مشرکین مکہ اور یہود ونصاریٰ ہیں۔

"فلا تک فی مرية" یہ خطاب حضورؐ کی طرف ہے مراد ساری امت ہے۔

صرف تورات کی طرف اشارہ کیوں؟

اس لیے کہ اوصاف پیغمبرؐ کا تذکرہ تورات میں زیادہ جامع اور وسیع طور پر آیا تھا۔ بہرحال تورات کے بارے میں "امام" کی تعبیر ہوسکتا ہے اس بنا پر ہو کہ شریعت موسیٰؑ کے تمام احکام اس میں موجود تھے۔ یہاں تک کہ عیسائی بھی اپنی بہت سی تعلیمات تورات سے لیتے ہیں۔

خود آزمائی

1. ''افمن کان علی بینة'' میں ''مَنْ'' کے مفہوم کے لیے دو تفسیریں ذکر کی گئیں ہیں وضاحت کریں۔
2. آیت بینہ میں شاهد سے کیا مراد ہے؟
3. آیت بینہ میں شاهد منه میں سے لفظ منه سے کیا مراد ہے؟
4. وہ کونسی چار وجوہ ہیں جن کی بنا پر آیت بینہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر دلالت کرتی ہے؟
5. تفسیر جامع میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی روایت کے مطابق خدا نے لوگوں پر کون سی پانچ چیزیں واجب کیں؟
6. حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حقانیت کے لیے صرف تورات کا ذکر کیوں کیا گیا جبکہ آپ کا تذکرہ گزشتہ تمام آسمانی کتب میں ہے؟

10

آیت عالم الکتاب

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ (سورۃ الرعد 13 آیت 43 پارہ 13)

ترجمہ: اور (اے رسولؐ) کافر کہتے ہیں کہ تم رسولؐ نہیں ہو۔ تم (ان سے) کہہ دو کہ میرے اور تمھارے درمیان (میری رسالت کی) گواہی کے لیے خدا اور وہ شخص جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے کافی ہے۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن کے معجزہ ہونے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔"یہ کافر کہتے ہیں کہ تو رسولؐ نہیں ہے۔" یہ لوگ ہر روز ایک نیا بہانہ تراشتے ہیں۔ ہر وقت معجزے کا تقاضا کرتے ہیں اور پھر بھی آخر کار کہتے ہیں کہ تو پیغمبرؐ نہیں ہے۔

ان کے جواب میں کہو: یہی کافی ہے کہ دو ہستیاں میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہیں ایک اللہ اور دوسرا وہ جس کے پاس کتاب کا علم اور قرآن کی آگہی موجود ہے۔

ایک تو خود خدا جانتا ہے کہ میں اس کا بھیجا ہوں اور دوسرے وہ لوگ کہ جو میری اس آسمانی کتاب یعنی قرآن کے بارے میں کافی آگہی رکھتے ہیں۔ وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی دماغ کی بنی ہوئی نہیں ہے اور ممکن نہیں ہے کہ خدائے بزرگ کے سوا یہ کسی اور کی ہو۔ یہ بھی مختلف پہلوؤں سے قرآن کے معجزہ ہونے کے بارے میں ایک تاکید ہے۔

چند اہم نکات

(الف) اللہ کی شہادت:

راغب اصفہانی نے المفردات صفحہ 268 میں شہادت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ "شہادت" وہ بات جو کامل علم ویقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدہ بصر سے حاصل ہوا ہو

یا بصیرت سے۔ اس میں دو مرحلے ہیں:

(i) تحمل شہادت (کسی چیز کی دریافت یا اس کا علم پیدا کرنے کے بارے میں)

(ii) ادائے شہادت اور اس کا اظہار

اللہ تعالیٰ نے مخالفین کے انکار کے جواب میں فرمایا: "اے رسولؐ کہہ دو میری رسالت پر اللہ شاہد (گواہ) ہے۔" قرآن پیغمبرؐ کی رسالت کی حقانیت پر بطور معجزہ قطعی نازل ہوا ہے اور کئی آیات میں خدا نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی ہے اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (اے رسولؐ) بے شک تم پیغمبروں میں سے ہو اور دین کے بالکل سیدھے راستے پر (ثابت قدم) ہو۔ (سورہ یٰسین آیت 3,4) اسی بنا پر پیغمبرؐ کی رسالت کی صداقت پر اللہ کی شہادت کافی ہو جاتی ہے اور مخالفین کے انکار کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔

(ب) عالمِ کتاب کی شہادت:

اللہ کی شہادت کے علاوہ پیغمبرؐ کی رسالت کی حقانیت پر دوسری شہادت کتاب کے عالم کی ہے۔

اب ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اس آیت "من عندہ علم الکتاب" میں کتاب سے مراد کیا ہے؟

کتاب کے معنی میں تین احتمالات بیان کیے گئے ہیں۔

1. کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ پس کتاب کے عالم سے مراد اللہ تعالیٰ ہے گویا تفسیر یہ بنے گی اللہ کی شہادت کافی ہے جو کتاب کا عالم ہے۔ یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

اولاً: دو کلموں پر یکے بعد دیگرے عطف کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے دو علیحدہ علیحدہ چیزیں مراد ہوتی ہیں اور اگر عالم کتاب کا معنی بھی اللہ تعالیٰ ہے تو پھر معنی یہ ہوگا کہ خدا

اور خدا جو کتاب کا عالم ہے شہادت کے لئے کافی ہے گویا عطف سے تکرار واقع ہوا جو فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے۔

ثانیاً: اگر عالم کتاب سے مراد خدا ہے تو لازمی ہے کہ ذات خدا عالم ہونے کی صفت کے ساتھ واقع ہو یہ بھی قبیح ہے۔ یہ ہوسکتا ہے خدا کی دو صفات حرف عطف کے ذریعے بیان کی گئی ہوں جیسا کہ ''شہادت کے لئے خدا جو عبادت کا مستحق ہے اور خدا جو کتاب کا عالم ہے کافی ہے۔'' بلکہ آیت کے ابتدا میں لفظ اللہ آیا ہے جو تمام صفات کا جامع ہے اور عطف کا خدا کے نام کے ساتھ کسی صفت سے تکرار قبیح ہے۔

2. اگر کتاب سے مراد تورات و انجیل یا خصوصاً تورات ہے تو پھر عالم کتاب کا معنی علمائے اہل کتاب ہوں گے جیسا کہ بعض نے کہا کہ یہاں عالم کتاب سے مراد عبداللہ بن سلام ہے۔

یہ احتمال بھی درست نہیں ہے۔ سورہ رعد مکہ میں نازل ہوئی اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ واقعہ پیغمبرؐ کی مدینہ کو ہجرت سے پہلے کا ہے اس وقت تک اہل کتاب کے علماء میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا تو وہ پیغمبرؐ کی رسالت کی حقانیت کی گواہی کیسے دے سکتے ہیں۔

3. آخری قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور عالم کتاب سے مراد وہ شخص ہے جو پورے قرآن کا عالم ہو یہ نظریہ درست ہے اور روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب سے مراد حقیقت قرآن ہو۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی بنا پر ''**من عنده علم الکتاب**'' سے مراد مضامین قرآن مجید سے آگاہ افراد ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء کی طرف اشارہ ہے۔

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ ''**من عنده علم الکتاب**'' سے مراد حضرت

علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر آئمہ ہدیٰ ؑ ہیں۔ اس سلسلے کی روایات تفسیر نور الثقلین اور تفسیر برہان میں جمع کر دی گئی ہیں۔

لیکن یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں کہ مفہوم آیت اسی پر منحصر ہے۔ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ ایک مصداق یا مصادیق تامہ وکاملہ کی طرف اشارہ ہیں۔ بہر حال یہ روایات پہلی تفسیر جسے ہم نے انتخاب کیا ہے کی تائید کرتی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے منقول ایک روایت پر ختم کریں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ [1] کے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ذَاکَ وَصِیُّ اَخِیْ سُلَیْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ "وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی اور جانشین (آصف بن برخیا) تھا۔"

حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا م بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتَابِ کس کے بارے میں ہے اور کس کی طرف اشارہ ہے؟

رسولؐ اللہ نے فرمایا: ذَاکَ اَخِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ

"وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب علیہما السلام ہیں" [2]

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: "اس سے مراد ہم ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بعد اس کے پہلے مصداق حضرت علی علیہ السلام ہیں جو ہم سب سے افضل واکمل ہیں۔" دوسری روایت میں ہے آپ نے اپنے سینے

[1] یہ آیت حضرت سلیمان کے واقعہ کے ضمن میں ہے۔ ترجمہ: اس شخص نے کہا کہ جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا (سورۃ النمل 27 آیت 40) [2] المیزان جلد 11 صفحہ 427

کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ ''خدا کی قسم کتاب پوری کا علم ہمارے پاس ہے''
اور شعبی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بعد قرآن کا پورا علم حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد طاہرینؑ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے اس نے کہا کہ اگر میں جانتا کہ کوئی شخص مجھ سے کتاب اللہ کا زیادہ عالم ہے تو میں اس کی شاگردی قبول کرتا پس فوراً کہنے والے نے حضرت علی علیہ السلام کا نام لیا تو ابن مسعودؓ نے کہا کیا میں نے اس سے حاصل نہیں کیا۔[1]

علامہ حلیؒ نے آیت مجیدہ کو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کی دلیل قرار دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب حضرت علی علیہ السلام کا تمام امت سے اعلم ہونا ثابت ہو گیا تو انہیں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا قائم مقام اور خلیفہ بلافصل ہونا چاہیے۔

تفسیر صافی میں ہے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا: ایک ہے **الذی عندہ علم من الکتاب** اور دوسرا ہے **من عندہ علم الکتاب** ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ آپؑ نے فرمایا ان دونوں میں اتنا فرق ہے جتنا مچھر کے پر پر آنے والے پانی اور سمندر کے پانی میں فرق ہے۔ پہلے کا علم (آصف بن برخیا کا علم) مچھر کے پر والے پانی کے قطرہ کی طرح ہے اور حضرت علی علیہ السلام کا علم ایک موجزن سمندر کی طرح ہے آپؑ نے فرمایا وہ علم ہمارے پاس ہے۔

[1] یعنی میں ان کی شاگردی قبول کر چکا ہوں اور ان سے حسب استعداد علم حاصل کر چکا ہوں۔

خلاصہ

اللہ کی شہادت:

قرآن پیغمبرؐ کی رسالت کی حقانیت پر بطور معجزہ قطعی نازل ہوا ہے۔اس آیت کے علاوہ کئی اور آیات میں بھی خدا نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی ہے۔

عالم کتاب کی شہادت:

''من عندہ علم الکتاب'' میں کِتَابٌ کے معنی میں مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں:

(i) کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے پس کتاب کے عالم سے مراد اللہ ہے۔

(ii) اگر کتاب سے مراد تورات وانجیل یا خصوصاً تورات ہے تو پھر عالم کتاب کا معنی علمائے اہل کتاب ہوں گے۔

(iii) آخری قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور عالم کتاب سے مراد وہ شخص ہے جو پورے قرآن کا عالم ہو یہ نظریہ درست ہے اور روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

'' مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ '' سے مراد :

(i) مضامین قرآن مجید سے آگاہ افراد ہیں لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء کی طرف اشارہ ہے۔

(ii) روایات تائید کرتی ہے کہ اس سے مراد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر آئمہ ہدیٰؑ ہیں بہر حال آیت میں ایک مصداق یا مصادیق تامہ وکاملہ کی طرف اشارہ ہیں۔

علامہ حلیؒ نے آیت کو حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل کی دلیل قرار دیا ہے جب آپؑ کا تمام امت سے اعلم ہونا ثابت ہوا تو آپؑ کو ہی رسولؐ کا قائم مقام اور خلیفہ بلا فصل ہونا چاہیے۔

خودآزمائی

1. لغت المفردات کی روشنی میں شہادت کا معنی بیان کریں؟
2. حضورؐ کی رسالت کے دوگواہ کون سے ہیں آیت کا حوالہ بھی دیں؟
3. تحمل شہادت اور ادائے شہادت سے کیا مراد ہے؟
4. آیت ''من عنده علم الکتاب'' کو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کی دلیل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟
5. الذی عنده علم من الکتاب اور من عنده علم الکتاب میں کیا فرق ہے بیان کریں؟

11

آیت تبلیغ

یَآاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکَافِرِیْنَ o

(سورۃ المائدہ 5 آیت 67 پارہ 6)

ترجمہ: اے رسولؐ جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ پہنچا دو اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) آپ نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا اور (تم خطرہ مت محسوس کرو) اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ خدا ہرگز کافروں کی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

تفسیر

پیغمبرؐ کے جانشین کا انتخاب ہی آخری کارِ رسالت تھا:

اس آیت کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے جو اسے اس سے پہلی آیات اور اس کے بعد کی آیات سے ممتاز کرتا ہے۔ اس آیت میں گفتگو صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور یہ آیت صرف انہی کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے۔

یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ سے اس آیت کی ابتداء ہو رہی ہے اور یہ آیت صراحت اور تاکید کے ساتھ پیغمبرؐ کو حکم دے رہی ہے کہ جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچادیں **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ**۔[1]

اس کے بعد اللہ (اس حکم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے) مزید تاکید کے طور پر خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر تم نے یہ کام نہ کیا (حالانکہ وہ ہرگز اسے ترک نہ کرتے) تو یہ ایسا ہوگا گویا تم نے (کوئی) رسالت کا کام سرانجام ہی نہیں دیا **وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ**۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ رسالت

[1] لفظ بلّغ جیسا کہ راغب اصفہانی نے المفردات میں لکھا ہے ابلغ کی نسبت زیادہ تاکید کو ظاہر کرتا ہے۔

اور پیغام کی ادائیگی کے لیے تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خدا تمہیں ان کے خطرات سے محفوظ رکھے گا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں سے جو اس مخصوص پیغام کا انکار کریں اور اس کے خلاف ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کفر اختیار کرلیں۔ دھمکی اور سزا کے عنوان سے یوں کہتا ہے کہ خدا ہٹ دھرمی کرنے والے کافروں کو ہدایت نہیں کرتا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ۔

آیت کے جملوں کی بندش، اس کا مخصوص لب ولہجہ اور اس میں پے در پے تاکیدوں پر تاکیدیں اور آیت کا يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ سے شروع ہونا جو تمام قرآن مجید میں صرف دو مقام پر ہے اور اس حکم کی تکمیل اور اس رسالت کی تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں پیغمبر کو یہ تہدید (دھمکی) کہ اگر تم نے اس حکم کے پہنچانے میں کوتاہی کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے کوئی کارِ رسالت سرانجام ہی نہیں دیا جو قرآن میں اسی آیت میں ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گفتگو کسی ایسے اہم امر کے متعلق ہو رہی ہے جس کی تبلیغ نہ کرنا کوئی بھی کارِ رسالت سرانجام نہ دینے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ موضوع ایسا تھا جس پر شدت سے مخالفت پیدا ہو چکی تھی اور اس موضوع کے مخالفین اتنے سخت تھے کہ ان کی مخالفت کے پیش نظر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ہی پریشان تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس اعلان کو سن کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیں اسی لئے خداتعالیٰ انہیں تسلی دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سا ایسا اہم مقصد و مطلب تھا جس کے پہنچانے کے لئے خداوندِ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اتنی تاکید کے ساتھ حکم دے رہا ہے؟

حالانکہ جب ہم اس سورہ کے نزول کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا

ہے کہ یہ سورۃ بلاشبہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں نازل ہوئی ہے۔

(i) کیا یہ توحید اور شرک و بت پرستی کے مسائل تھے؟

یہ مسائل تو برسوں پہلے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کے لئے حل ہو چکے تھے۔

(ii) کیا یہ مسائل احکام شرع اور قوانین اسلام سے متعلق تھے؟

جبکہ اس وقت تک ان کے اہم ترین مسائل بیان ہو چکے تھے۔

(iii) کیا یہ مسائل اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے مربوط تھے؟

ہمیں معلوم ہے کہ بنی النضیر ، بنی قریظہ اور بنی قینقاع نیز خیبر و فدک اور نصارائے نجران کے واقعے کے بعد اہل کتاب کا کوئی مسئلہ مسلمانوں کے لئے مشکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

(iv) کیا یہ منافقین کے مسائل تھے؟

فتح مکہ کے بعد جب اسلام کا پورے جزیرہ نمائے عرب پر تسلط اور نفوذ ہو گیا تو منافقین کا معاشرے میں کوئی مقام ہی نہیں رہا تھا اور ان کی قوت بالکل ہی ٹوٹ چکی تھی اور ان کے پاس جو کچھ تھا وہ ان کے باطن میں تھا۔

اس حقیقت میں بھی تردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اضطراب اور پریشانی اپنی ذات اور اپنے نفس کے لئے نہیں تھی بلکہ مخالفین کی طرف سے ان احتمالی مخالفتوں کے بارے میں تھی جن کا نتیجہ مسلمانوں کے لئے خطرات اور نقصانات کی صورت میں نکلتا۔

(v) کیا پیغمبرؐ کے جانشین کے تعین اور اسلام و مسلمین کے آئندہ معاملات کے سوا کوئی اور مسئلہ ایسا ہو سکتا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں؟

اب ہم ان مختلف روایات کی طرف لوٹتے ہیں جو اہل سنت اور اہل تشیع کی متعدد کتابوں میں آیت مذکورہ بلغ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان روایات سے مذکورہ احتمال کے ثابت کرنے میں کہاں تک استفادہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہم ان اعتراضات اور سوالات پر بحث کریں گے جو اس تفسیر کے بارے میں اہل سنت کے بہت سے مفسرین کی طرف سے ظاہر کیے گئے ہیں۔

شان نزول:

اگرچہ انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس آیت کے حقائق تمام مسلمانوں تک نہیں پہنچائے گئے۔ پہلے سے کیے گئے فیصلے اور مذہبی تعصّبات ان کے اظہار میں حائل رہے ہیں لیکن اس کے باوجود اہل سنت کے علماء کی تحریر کردہ مختلف کتابوں میں خواہ وہ تفسیر کی کتابیں ہو یا حدیث وتاریخ کی ان میں بہت زیادہ روایات ایسی ملتی ہیں جو صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ان روایات کو بہت سے صحابہؓ نے نقل کیا ہے مثلاً زید بن ارقمؓ، ابوسعید خدریؓ، ابن عباسؓ، جابر ابن عبداللہ انصاریؓ، ابو ہریرہؓ، براء بن عازبؓ، حذیفہؓ، عامر بن لیلیٰ بن ضرہؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ یہ سب کے سب اصحابؓ اس بات پر متفق ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور واقعہ غدیر کے متعلق ہی نازل ہوئی ہے۔

یہ احادیث مذکورہ اصحاب پیغمبرؐ سے مختلف طرق سے بیان ہوئی ہے مثلاً:

زید بن ارقمؓ کی بیان کردہ حدیث ایک طرق سے،

ابوسعید خدریؓ کی بیان کردہ حدیث گیارہ طرق سے،

ابن عباسؓ کی بیان کردہ حدیث گیارہ طرق سے،

براء بن عازبؓ کی بیان کردہ حدیث تین طرق سے نقل کی گئی ہے۔

جن علماء نے اپنی کتابوں میں ان احادیث کو تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے وہ بہت زیادہ ہیں۔جن میں سے بعض کے نام ہم نمونہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں:

1. حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اپنی کتاب "مَا اَنُزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ فِیُ عَلِیٍّ" میں بحوالہ خصائص صفحہ 29 یہ روایت درج کی ہے۔
2. ابوالحسن واحدی نیشاپوری نے اسباب النزول صفحہ 150 میں۔
3. حافظ ابوسعید بجستانی نے کتاب الولایۃ میں (کتاب طرائف کے حوالے سے)۔
4. ابن عساکر شافعی نے (درمنثور جلد 2 صفحہ 298 کے حوالے سے)۔
5. فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر جلد 3 صفحہ 636 میں۔
6. ابواسحاق حموینی نے فرائدالسمطین میں۔
7. ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ صفحہ 27 میں۔
8. جلال الدین سیوطی نے درمنثور جلد 2 صفحہ 298 میں۔
9. قاضی شوکانی نے فتح القدیر جلد سوم صفحہ 57 میں۔
10. شہاب الدین آلوسی شافعی نے روح المعانی جلد 6 صفحہ 172 میں۔
11. شیخ سلمان قندوزی حنفی نے ینابیع المودۃ صفحہ 130 میں۔
12. بدرالدین حنفی نے عمدۃ القادری فی شرح صحیح بخاری جلد 8 صفحہ 576 میں۔
13. شیخ محمد عبدہ مصری نے تفسیر المنار جلد 6 صفحہ 463 میں۔
14. حافظ ابن مردویہ (متوفی 416) نے سیوطی کی درمنثور کے حوالے سے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء اہل سنت نے آیت مذکورہ کی یہی شان نزول بیان کی ہے اس سے یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ مذکورہ علماء و مفسرین نے آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نزول کو قبول بھی کرلیا ہے بلکہ اس سے

ہماری مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس مطلب سے متعلق روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اگرچہ اپنے معاشرے کے مخصوص حالات کے خوف سے یا پہلے سے کیے ہوئے غلط فیصلے کی بناء پر انہوں نے اسی مشہور روایت کو نقل کرنے کے باوجود قبول نہیں کیا اور عموماً پہلے سے طے شدہ رائے ایسے موقعوں پر صحیح فیصلہ کرنے میں حائل ہوتی ہیں۔ بعض نے تو یہ کوشش کی ہے کہ جتنا بھی ہو سکے اس کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کیا جائے مثلاً فخر الدین رازی نے اس شان نزول کی اہمیت کم کرنے کے لئے اسے آیت کا دسواں احتمال قرار دیا ہے اور دوسرے 9 احتمال جو انتہائی کمزور اور بہت ہی بے ہودہ اور بے وقعت ہیں انہیں پہلے بیان کیا ہے۔

فخر الدین رازی پر زیادہ تعجب نہیں کیونکہ اس کا تو ہر جگہ یہی انداز ہے لیکن تعجب تو ان روشن فکر لکھاریوں پر ہے جنہوں نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں مطلقاً کوئی گفتگو ہی نہیں کی یا اس کو اتنی کم اہمیت دی ہے کہ کسی کی اس طرف توجہ ہی نہ جائے جیسا کہ سید قطب نے "فی ظلال" میں اور محمد رشید رضا نے "المنار" میں اس کی شان نزول کو بالکل بیان ہی نہیں کیا۔

ہمیں نہیں معلوم کہ آیا ان کا ماحول اس حقیقت کو بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا یا تعصب آمیز فکری حجاب اتنے زیادہ تھے کہ ان کی روشن فکری اس حقیقت کی گہرائی تک نہ پہنچ سکی۔

البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کی شان نزول کو حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں برملا تسلیم کیا ہے لیکن انہوں نے اس بات کی تردید کی ہے کہ یہ آیت مسئلہ ولایت و خلافت پر دلالت کرتی ہے۔ بہر حال وہ روایات جو اس بارے میں شیعہ کتب میں ہی نہیں بلکہ اہل سنت کی معروف کتابوں میں بھی ہے اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا اور نہ انہیں آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی شان نزول میں تو ایک دو

احادیث پر اکتفا کر لیا جاتا ہے لیکن اس آیت کی شان نزول کے بارے میں اتنی کثیر روایات کو بھی کیوں کافی نہیں سمجھا جاتا۔

کیا یہ آیت ایسی خصوصیت رکھتی ہے جو دوسری آیات نہیں رکھتیں۔

کیا اس آیت کے سلسلے میں اس سخت رویے کی کوئی منطقی دلیل مل سکتی ہے۔

دوسری بات جس کی یاد دہانی اس مقام پر ضروری ہے یہ ہے کہ جو روایات ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ تو صرف وہ تھیں جو اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں (یعنی وہ روایات تھیں جو اس آیت کی شان نزول کے متعلق تھیں) ورنہ وہ روایات جو غدیر خم کے مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے خطبہ پڑھنے اور حضرت علی علیہ السلام کا بطور وصی و ولی کے تعارف کرانے کے بارے میں منقول ہے وہ تو ان سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

چنانچہ امینی نے اپنی کتاب ''الغدیر'' میں حدیث غدیر کو 110 اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم، 84 تابعین، 360 علماء اور مشہور کتب اسلامی سے اسناد و مدارک کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مذکورہ حدیث قطعی ترین متواتر احادیث میں سے ہے اور اگر کوئی شخص اس حدیث و روایت کے قطعی ہونے میں بھی شک وشبہ کرے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ کسی بھی متواتر حدیث کو قبول نہیں کر سکتا۔

واقعہ غدیر کا خلاصہ:

وہ بہت سی روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ سب کی سب ایک ہی واقعہ کے گرد گھومتی ہیں۔ پھر بھی طرح طرح کی تعبیرات کی حامل ہیں۔ بعض روایات بہت مفصل اور طویل ہیں۔ بعض مختصر لیکن جچی تلی ہیں۔ بعض روایات اس واقعہ کا ایک گوشہ بیان کرتی

ہیں تو دوسری روایات اس واقعہ کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان تمام روایات کے مجموعے اور اسلامی تواریخ، قرائن، حالات، ماحول اور مقامِ واقعہ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا آخری سال تھا۔ حجۃ الوداع کے مراسم باوقار اور پرشکوہ تھے۔ ساتھ ہی سب کے دل روحانیت سے سرشار تھے۔ ابھی ان کی روح اس عظیم عبادت کی روحانی لذت کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ اصحابِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس عظیم نعمت سے فیض یاب ہونے اور اس سعادت کے حاصل ہونے پر بہت خوش تھے۔ [1]

نہ صرف مدینے کے لوگ اس سفر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان بھی یہ عظیم تاریخی اعزاز وافتخار حاصل کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے۔

سرِ زمین حجاز کا سورج دروں اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی مٹھاس تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہی تھی۔ زوال کا وقت نزدیک تھا۔ آہستہ آہستہ جحفہ کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلانے والے "غدیر خم" کے بیابان نظر آنے لگے۔

دراصل یہاں پر ایک چوراہا ہے جو حجاز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شمالی راستہ مدینہ کی طرف، دوسرا مشرقی راستہ عراق کی طرف، تیسرا راستہ مغربی ممالک اور مصر کی طرف اور چوتھا جنوبی راستہ سرزمین یمن کو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر آخری مقصد اور اس عظیم سفر کا اہم ترین کام انجام پذیر ہونا تھا تاکہ مسلمان پیغمبر صلی اللہ علیہ و

[1] پیغمبر اکرم کے ہمراہ جانے والوں کی تعداد بعض نے 90 ہزار بعض نے 114 ہزار بعض نے 120 ہزار اور بعض نے 124 ہزار لکھی ہے۔

آلہ وسلم کی اہم ذمہ داریوں میں سے ان کا آخری حکم جان کر ایک دوسرے سے جدا ہوں۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے۔ اچانک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کے ہمراہیوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں نے بلند آواز سے ان لوگوں کو جو قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے واپس لوٹنے کے لئے پکارا اور اتنی دیر کے لئے ٹھہر گئے کہ پیچھے آنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔ آفتاب خط نصف النہار سے گزر گیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نماز ظہر پڑھنے کی دعوت دی۔ مسلمان جلدی جلدی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن فضا اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی حصہ سر کے اوپر لے لیں ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعاعیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہے تھے۔

اس صحرا میں کوئی سائبان نظر آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس۔ صرف چند بے برگ وبار بیابانی درخت تھے جو گرمی کی سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔ کچھ لوگ انہیں چند درختوں کا سہارا لیے ہوئے تھے اور انہوں نے ان برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبرؐ کے لئے سائبان سا بنا رکھا تھا۔ لیکن گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزرتی ہوئی سورج کی جلانے والی گرمی کو اُس سائبان کے نیچے بھی پھیلا رہی تھی۔ بہرحال ظہر کی نماز پڑھ لی گئی۔ مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لیں جو انہوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوند تعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لئے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور تھے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

ملکوتی (روحانی) چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے اوپر تشریف لے گئے۔ پروردگار عالم کی حمد و ثنا بجالانے کے بعد فرمایا:

میں عنقریب خداوند تعالیٰ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں۔ میں بھی جواب دہ ہوں اور تم بھی جواب دہ ہو۔ تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے۔ لوگوں نے بلند آواز میں کہا:

نَشْهَدُ اِنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ نَصَحْتَ جُهْدَکَ فَجَزَاکَ اللّٰهُ خَيْرًا

ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی و کوشش کی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن وفات پا جانے والوں کے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خداوندا گواہ رہنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا: لوگو ! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”دیکھو! میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟“

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ دو گراں قدر چیزیں کون سی ہیں؟

تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے۔ اس کا ایک سرا پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت علیہم السلام ہیں اور مجھے خدائے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔ ان دونوں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔''

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جونہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا۔ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔ اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اَیُّهَا النَّاسُ مَنْ اَوْلَی النَّاسِ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ''

اے لوگو! بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود ان سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟

اس پر سب حاضرین نے بہ یک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خدا میرا مولا و رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا و رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ

ان کے ارادے سے مقدم ہے)''

اس کے بعد فرمایا: '' فَمَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ''

''جس جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس اس کا مولا و رہبر ہے''۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:

'' اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ وَاَحِبَّ مَنْ اَحَبَّهُ وَابْغِضْ مَنْ اَبْغَضَهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ وَاَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَیْثُ دَارَ.''

یعنی بارالہٰا جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ اور جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رخ کرے۔

اس کے بعد فرمایا: '' اَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ '' تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ ختم ہو گیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ دوسرے تمام حاضرین کے بھی سروں سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا۔ ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرائیل امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان الفاظ میں بشارت دی: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ ... (سورۃ مائدہ آیت 3) ''آج کے دن

میں نے تمہارے لئے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا۔"

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ عَلٰی اِکْمَالِ الدِّیْنِ وَاِتْمَامِ النِّعْمَۃِ وَرَضِیَ الرَّبُّ بِرِسَالَتِیْ وَالْوِلَایَۃِ لِعَلِیٍّ مِّنْ بَعْدِیْ " ہر طرح کی بزرگی خدا ہی کے لئے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد حضرت علی علیہ السلام کی ولایت سے راضی ہوا۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے اعلان سن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا۔لوگ بڑھ بڑھ کر اُس اعزاز و منصب پر حضرت علی علیہ السلام کو اپنی طرف سے مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں:

" بَخٍّ بَخٍّ لَکَ یَا بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ
وَاَمْسَیْتَ مَوْلَایَ وَمَوْلَا کُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَۃٍ. "

مبارک ہو! مبارک ہو! اے فرزند ابی طالبؑ کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر ہو گئے۔

اس وقت ابن عباسؓ نے کہا:

بخدا ! یہ عہد و پیان سب کی گردنوں پر باقی رہے گا۔

عرب کے مشہور شاعر مداح رسولؐ حسان بن ثابتؓ نے پیغمبرؐ سے اجازت لے کر اس موقع کی مناسبت سے ایک قصیدہ پڑھا جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

یُنَادِیْهِمْ یَوْمَ الْغَدِیْرِ نَبِیُّهُمْ بِخُمٍّ وَاَسْمِعْ بِالرَّسُوْلِ مُنَادِیًا

فَقَالَ فَمَنْ کُنْتُ مَوْلَاکُمْ وَنَبِیُّکُمْ فَقَالُوْا وَلَمْ یَبْدُوْا هُنَاکَ التَّقَادِیَا
اِلٰهُکَ مَوْلَانَا وَاَنْتَ نَبِیُّنَا وَلَنْ اَجِدَنَّ مِنَّافِیْ الْوِلَایَةِ عَاصِیًا
فَقَالَ لَهٗ قُمْ یَاعَلِیُّ فَاِنَّنِیْ رَضِیْتُکَ مِنْ بَعْدِیْ اِمَامًا وَّهَادِیًا
فَمَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِیُّهٗ فَکُوْنُوْا لَهٗ اِتْبَاعَ صِدْقٍ مُوَالِیًّا
هُنَاکَ دَعَا اللّٰهُمَّ وَالِ وَلِیَّهٗ وَکُنْ لِلَّذِیْ عَادَ عَلِیًّا مُعَادِیًا

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر کے دن خم کے مقام پر انہیں ندا دی اور پکارا اور یہ پکارنے والا کس قدر گرامی قدر تھا۔

فرمایا: تمہارا مولا اور تمہارا نبی کون ہے؟ تو انہوں نے بلا تردد و صراحت کے جواب دیا۔

اس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کھڑے ہو جاؤ کیونکہ میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور رہبر منتخب کیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: جس شخص کا میں مولا و رہبر ہوں یہ علیؑ اس کے مولا و رہبر ہیں۔ پس تم سچے دل سے ان کی پیروی کرنا۔

اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کی: بارالہا! اس کے دوست کو دوست اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔ [1]

یہ مشہور حدیث غدیر کا خلاصہ تھا جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں موجود ہے۔

[1] یہ اشعار اہل سنت کے بہت سے علماء نے نقل کیے ہیں ان میں حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ سعید بجستانی، خوارزمی مالکی، حافظ ابو عبداللہ مرزبانی گنجی شافعی، جلال الدین سیوطی، سبط ابن جوزی اور صدر الدین حموی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

جرح وتنقید اور اعتراضات:

اس میں شک نہیں کہ اگر یہ آیت خلافت حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کسی دوسرے موضوع سے متعلق ہوتی تو ان روایات اور خود آیت میں موجود قرائن سے کم مقدار پر بھی قناعت کر لی جاتی۔ جیسا کہ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے مفسرین نے قرآن کریم کی باقی تمام آیات کی تعبیر میں بعض اوقات زیر نظر آیت کی موجود مدارک کے دسویں حصہ بلکہ اس سے بھی کم تر پر قناعت کر لی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر تعصب کے پردے بہت سے حقائق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔

جن لوگوں نے اس آیت کی تفسیر اور ان متعدد روایات کے متعلق جو اس آیت کی شان نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اختلاف کیا ہے دو قسم کے لوگ ہیں۔

(i) وہ لوگ جو شروع ہی سے نہ صرف دشمنی اور ہٹ دھرمی سے اس پر بحث کرتے ہیں بلکہ انہوں نے شیعوں کی ہتک وتوہین اور بدگوئی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

(ii) وہ لوگ جنہوں نے روح تحقیق کی حفاظت کی ہے اور وہ کسی حد تک حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں لہٰذا انہوں نے استدلال کی راہ اپنائی ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حقائق کے ایک حصے کا اعتراف کر لیا ہے لیکن انہوں نے اس آیت اور اس سے مربوط روایات بیان کرنے سے پہلے کچھ اشکالات بیان کیے ہیں اور وہ اشکالات جو شاید ان خاص حالات کا نتیجہ تھے جو ان کے فکری ماحول پر محیط تھے۔

پہلے گروہ کا واضح نمونہ ابن تیمیہ ہے۔ اس نے اپنی کتاب منہاج السنۃ میں بیان کیا ہے۔ اس میں اس کی حالت بالکل اس شخص کی طرح ہے جو روشن دن میں اپنی آنکھیں بند کر لے اور اپنی انگلیاں زور سے کانوں میں ٹھونس لے اور چلانا شروع کر

دے کہ سورج کہاں ہے۔ نہ تو وہ اپنی آنکھوں کو کھولنے کے لیے تیار ہوتا ہے کہ کچھ حقائق کو دیکھ لے نہ کانوں سے انگلیاں نکالنے پر آمادہ ہوتا ہے کہ کچھ اسلامی محدثین و مفسرین کی داد وفریاد سن سکے۔ بس مسلسل اور پے در پے گالیاں دیے جا رہا ہے اور ہتک حرمت پر کمر بستہ ہے۔ ایسے افراد جہالت، بے خبری، ہٹ دھرمی اور سخت تعصب کے ہاتھوں اتنے مجبور ہیں کہ ایسے واضح اور بدیہی مسائل کا بھی انکار کر دیتے ہیں جن کا ہر آدمی آسانی کے ساتھ ادراک کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کی باتیں نقل کرنے کی ہم اپنے آپ کو زحمت دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے جوابات پڑھنے کی تکلیف قارئین کو دیتے ہیں کیونکہ عظیم اسلامی علماء و مفسرین جن کی اکثریت علماء اہل سنت میں سے ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور جو شخص ان کے خلاف ضد کرے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسی کوئی چیز اپنی کتاب میں نقل نہیں کی ایسے شخص کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور ایسے آدمی کی بات کیا وزن رکھتی ہے کہ جس پر ہم بحث کریں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ان بہت سی معتبر کتابوں کے مقابلے میں جن میں اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اپنی برأت کے لیے اس مضحکہ خیز جملہ پر اکتفا کیا ہے:

''ان علماء میں سے جو یہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کوئی بھی اس آیت کو حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونا نہیں جانتا۔''

گویا صرف علماء جو ابن تیمیہ کے عناد آلود ہٹ دھرمی کے رجحانات کے ساتھ ہم آواز ہیں صرف وہی ''سمجھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں'' ورنہ جو شخص اس کا ہم آواز نہیں ہے وہ ایسا دانشمند ہے جسے یہ پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ یہ ایسے شخص کی منطق ہے

جس کی فکر پر خود پسندی اور ہٹ دھرمی سایہ فگن ہے۔ ہم اس گروہ کا ذکر یہیں پر چھوڑتے ہیں البتہ ان اعتراضات میں سے جو دوسرے گروہ نے کیے ہیں ان میں سے چند قابل بحث ہیں ہم ذیل میں آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے؟

''مولیٰ'' کے معانی میں سے ایک معنی دوست اور مددگار بھی ہیں۔ یہاں یہ معنی کیوں نہیں مراد لیا جاسکتا۔

اس بات کا جواب کوئی مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہر غیر جانبدار شخص جانتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی دوستی کے ذکر اور یاد دہانی کے لیے ان مقدمات و تشکیلات اور خشک جلا دینے والے بیابان کے وسط میں خطبہ پڑھنے اور لوگوں کو وہاں ٹھہرانے اور ان سے پے در پے اقرار لینے اور اعتراف کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کا ایک دوسرے سے دوستی رکھنا مسائل اسلامی میں سے ایک ضروری مسئلہ تھا جو آغاز اسلام سے ہی موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہ کوئی ایسا مطلب نہیں تھا کہ جس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس وقت تک تبلیغ نہ کی ہو بلکہ آپ تو بارہا اس کی تبلیغ کر چکے تھے۔ یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ جس کے اظہار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پریشان ہوں اور خدا کو اس کے لیے تسلی اور حفاظت کی ضمانت دینی پڑے۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا کہ خداوند عالم اس لب ولہجہ کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے گفتگو کرتا ''اگر اس کی تبلیغ نہ کی تو رسالت کی تبلیغ بھی نہیں کی'' یہ سب چیزیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ مسئلہ ایک عام دوستی سے بہت اونچا تھا وہ دوستی جو اخوت اسلامی کا آغاز شمار ہوتی تھی۔

اگر اس سے عام اور سادہ دوستی کا بیان کرنا ہی منظور ہوتا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلّم پہلے یہ اقرار لوگوں سے کیوں لیتے: " اَلَسۡتُ اَوۡلٰی بِکُمۡ مِنۡ اَنۡفُسِکُمۡ " [1] کیا میں تمہاری نسبت تمہارے نفوس پر خود تم سے زیادہ حق دار اور صاحب اختیار نہیں ہوں۔

کیا یہ جملہ ایک عام دوستی کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت رکھتا ہے۔ نیز ایک عام دوستی تو یہ مقام نہیں رکھتی تھی کہ لوگ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی حضرت علی علیہ السلام کو مبارک باد پیش کرے۔ " اَصۡبَحۡتَ مَوۡلَایَ وَ مَوۡلَا کُلِّ مُؤۡمِنٍ وَمُؤۡمِنَةٍ " اے علیؑ! آپ میرے اور ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کے مولا ہو گئے۔ یقیناً حضرت عمرؓ حضرت علی علیہ السلام کے لیے اسے ایک نیا منصب اور اعزاز شمار کرتے تھے۔ [2]

کیا حضرت علی علیہ السلام اس دن تک ایک عام مسلمان کی حیثیت سے بھی پہچانے نہیں گئے تھے کیونکہ ایک مسلمان کی دوستی تو تمام مسلمانوں پر لازم وضروری ہے۔

کیا مسلمانوں کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے دوستی کرنا کوئی نئی بات تھی کہ جس کے لیے مبارک باد دینے کی ضرورت ہو اور وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کے آخری سال میں۔

کیا حدیث ثقلین اور وداع پیغمبرؐ سے تعلق رکھنے والی تعبیرات کا حضرت علی علیہ السلام کی دوستی کے مسئلہ سے بھی کوئی رابطہ ہو سکتا ہے؟

بلا شبہ حضرت علی علیہ السلام کی مومنین کے ساتھ ایک عام دوستی کا تقاضا یہ نہیں ہے

[1] یہ جملہ متعدد روایات میں وارد ہوا ہے۔ [2] اس واقعہ کے اس حصّے کو جو کہ حدیث تہنیت کے نام سے مشہور ہے اہل سنت کے بہت سے عظیم علماء حدیث و تفسیر و تاریخ میں متعدد طریقوں سے صحابہ سے نقل کیا ہے مثلاً ابن عباس، ابو ہریرہ، براء بن عازب اور زید بن ارقم۔ مرحوم علامہ امینی الغدیر کی پہلی جلد میں اس حدیث کو اہل سنت کے ساٹھ علماء سے نقل کیا ہے۔

کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اسے قرآن کے ہم پلہ اور برابر قرار دیں۔ ۱

کیا ہر غیر جانبدار شخص اس تعبیر سے یہ نہیں سمجھتا کہ یہاں پر مسئلہ رہبری وامامت سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی رحلت کے بعد قرآن مسلمانوں کا پہلا رہبر ہے۔ لہٰذا اسی بنیاد پر اہل بیتؑ مسلمانوں کے دوسرے رہبر ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ یہاں مولا بمعنی دوست و مددگار نہیں ہے بلکہ مولا بمعنی اولیٰ ہے۔ مولا کا لفظ اس معنی کے لحاظ سے ہر اس پر بولا جاتا ہے جو کوئی بلند مرتبہ اور مقام رکھتا ہو جس کے حکم کی اطاعت کی جائے اور اس کا امر نافذ اور واجب العمل ہو۔

اگر آپ کسی سے کہیں کہ آپ میرے مولا ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ آپ میرے نفس اور جان پر پورا تصرف رکھتے ہیں اور اس پر اولیٰ ہیں۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ (سورۃ الاحزاب آیت 6)

پیغمبر مومنین پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ۲

2. آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط:

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل و بعد کی آیات اہل کتاب اور ان کی غلط کاریوں کے بارے میں ہیں۔ خاص طور پر تفسیر المنار کے مؤلف نے جلد 2 صفحہ 466 پر اس مسئلہ پر زیادہ زور دیا ہے۔

ہم کہتے ہیں اول تو اس آیت کا لب ولہجہ اور اس کا قبل و بعد کی آیات سے فرق

۱ حدیث غدیر ان متواتر احادیث میں سے ہے جسے اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں متعدد صحابہ سے نقل کیا گیا ہے مثلاً ابو سعید خدری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابو ہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ بن حنطب، عبد بن حمید، جبیر بن مطعم، ضمرہ اسمی، ابوذر غفاری، ابورافع اور ام سلمہ نے پیغمبر سے نقل کیا ہے۔

۲ مزید تفصیل کے لیے ہماری کتاب فرمانِ رسولؐ صفحہ 103 سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

مکمل طور پر یہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس آیت میں موضوع کوئی ایسی چیز ہے جو قبل و بعد کی آیات سے مختلف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن ایک کلاسیکی کتاب نہیں ہے کہ جس کے مطالب کو خاص حصوں اورابواب میں ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہو بلکہ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی اورمختلف حادثات و واقعات رونما ہوتے گئے ان کے مطابق نازل ہوتا رہا۔لہٰذا ہم دیکھتے ہیں قرآن ایک جنگ کے متعلق بحث کرتے کرتے یکا یک ایک فروعی حکم کا ذکر چھیڑ دیتا ہے یا جب وہ یہود ونصاریٰ کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو اچانک ہی مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک اسلامی حکم بیان کردیتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض متعصب قسم کے لوگوں کواس بات پر اصرار ہے کہ یہ آیت ابتداء بعثت میں نازل ہوئی ہے حالانکہ سورۃ مائدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہےاور اگر وہ یہ کہیں کہ صرف یہ ایک آیت مکہ میں ابتداء بعثت میں نازل ہوئی ہےاوراس کے بعد کسی مناسبت سے اس سورۃ کی آیات کے درمیان آگئی ہےتو ہم کہیں گے کہ یہ بات تو بالکل اس بات کے الٹ ہے جسے آپ منوانا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائے بعثت میں نہ تو پیغمبرؐ یہودیوں کے ساتھ برسر جنگ تھےاور نہ ہی عیسائیوں کے ساتھ۔اس بنیاد پرتواس آیت کا قبل وبعد کی آیات سے کوئی تعلق ہی نہ رہے گا۔

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت تعصب کے طوفان کی زد میں آگئی ہے۔اسی بناپراس میں کئی طرح کے احتمالات پیدا کیے جاتے ہیں جب اس جیسی دوسری آیات میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی ہرایک اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی حیلہ وبہانہ سے یا کسی بے بنیاد دستاویز کے ذریعہ اس کے مفہوم کواس کے صحیح راستے سے ہٹادے۔

3. کیا یہ حدیث تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے:

بعض کہتے ہیں کہ ہم کس طرح اس حدیث کو قبول کر سکتے ہیں جب بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی کتاب میں اسے نقل نہیں کیا ہے؟

یہ اعتراض بھی عجائبات میں سے ہے کیونکہ اول تو بہت سی معتبر احادیث ایسی ہیں جنہیں علمائے اہل سنت نے قبول کیا ہے حالانکہ وہ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں نہیں ہیں اور یہ کوئی پہلی حدیث بھی نہیں کہ جس کی یہ وضع وکیفیت ہو۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ کیا ان کے نزدیک صرف یہی دو کتابیں معتبر ہیں حالانکہ یہ حدیث ان کے قابل اعتماد منابع اور کتب میں موجود ہیں یہاں تک کہ صحاح ستہ[1] مثلاً سنن ابن ماجہ جلد اول صفحہ 55,58 میں یہ حدیث موجود ہے اسی طرح مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ 84,88,119,152,331,370,38 میں بھی یہ حدیث آئی ہے۔ حاکم، ذھبی اور ابن حجر جیسے علماء نے بھی اس حدیث کے بہت سے طرق کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

بعید نہیں کہ بخاری ومسلم اس مخصوص فضا اور گھٹے ہوئے ماحول میں صریحاً اپنی کتاب میں ایسی چیز نہ لکھ سکے ہوں یا لکھنا نہ چاہتے ہوں جو اس وقت کے صاحبان اقتدار کے مزاج کے خلاف تھی۔

4. حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ نے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر حدیث غدیر اس عظمت کے ساتھ موجود تھی تو خود حضرت علی علیہ السلام نے اور ان کے اہل بیتؑ اور یار وانصار اور ان سے تعلق رکھنے والوں نے

[1] اہل سنت کی چھ مشہور کتابیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں۔

کم ازکم ضروری مقامات پر اس سے استدلال کیوں نہ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے اس قسم کے اہم مدرک کو سند کے طور پر پیش کرتے؟

یہ اعتراض بھی اسلامی کتابوں سے خواہ وہ حدیث سے متعلقہ ہوں یا تاریخ وتفسیر سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں اکثر مقامات پر یہ ذکر موجود ہے کہ خود حضرت علی علیہ السلام نے یا آئمہ اہل بیتؑ نے یا اس مسلک سے تعلق رکھنے والوں نے حدیث غدیر سے استدلال کیا۔ ان میں سے ایک واقعہ خود حضرت علی علیہ السلام سے متعلق ہے۔ جسے خطیب خوارزمی نے عامر بن واصلہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ عامر کہتا ہے:

میں شوریٰ کے روز حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ اس گھر میں موجود تھا۔ میں نے خود سنا کہ آپؑ ارکان شوریٰ سے اسی طرح کہہ رہے تھے کہ میں ایک ایسی محکم دلیل تمہارے سامنے قائم کرتا ہوں جسے عرب وعجم مل کر بھی تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

تمہیں خدا کی قسم! بتلاؤ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص ہے جس نے مجھ سے پہلے خدا کو اس کی توحید و یکتائی کے ساتھ پکارا ہو؟

اس کے بعد آپؑ نے خاندان رسالت کی معنوی (روحانی و باطنی) عظمتیں بیان کیں یہاں تک کہ آپؑ نے فرمایا:

تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں! بتلاؤ کیا تمہارے درمیان میرے علاوہ اور کوئی شخص ایسا ہے جس کے حق میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے یہ کہا ہو: "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ."
سب نے کہا نہیں۔ (مناقب صفحہ 217)

یہ روایت حموینی نے فرائد السمطین باب 58 میں اور اسی طرح "ابن حاتم" نے "دار النظیم" میں، دار قطنی نے اپنی کتاب میں، ابن عقدہ نے اپنی کتاب میں اور ابن ابی

الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں نقل کی ہے۔

فرائد السمطین کے باب 58 میں منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسجد کے اندر چند لوگوں کی موجودگی میں بھی واقعہ غدیر سے استدلال کیا تھا۔ اسی طرح کوفہ میں ان لوگوں کے سامنے بھی جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی طرف سے ان کی خلافت بلافصل کے لئے نص ہونے کا انکار کر رہے تھے صراحت کے ساتھ اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ الغدیر کے مطابق اس حدیث سے یعنی کوفہ میں واقعہ غدیر سے آپ کے استدلال کو اہل سنت کی مشہور کتابیں اور معروف ماخذوں میں چار صحابہؓ اور چودہ تابعین سے روایت کیا گیا ہے۔

جنگ ''جمل'' کے دن بھی ''حاکم'' کی کتاب مستدرک جلد سوم صفحہ 371 کی روایت کے مطابق طلحہ کے سامنے حدیث غدیر سے استدلال فرمایا۔

نیز جنگ ''صفین'' کے دن ''سلیم بن قیس ہلالی'' کی روایت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نے اپنے لشکر گاہ میں مہاجرین وانصار اور اطراف وجوانب سے آنے والے لوگوں کے سامنے اس حدیث سے استدلال کیا اور بدرئین (جو جنگ بدر میں پیغمبر کے ساتھ تھے) میں سے بارہ افراد نے اکٹھے ہو کر گواہی دی کہ انہوں نے یہ حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے سنی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام، عبداللہ بن جعفرؓ، عمار بن یاسرؓ، قیس بن سعد، عمر ابن عبدالعزیز اور عباسی خلیفہ مامون نے بھی اس حدیث کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ عمر بن عاص نے اس خط میں جو اس نے معاویہ کو اس لئے لکھا تھا تاکہ وہ اس پر اچھی طرح سے یہ بات ثابت کر دیں کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے مرتبہ ومقام اور معاویہ کی وضع

سے متعلق حقائق سے خوب آگاہ ہیں۔ اس خط میں اس نے صراحت کے ساتھ مسئلہ غدیر کا ذکر کیا تھا اور خطیب خوارزمی حنفی نے اپنی کتاب مناقب کے صفحہ 24 پر اسے نقل کیا ہے۔

وہ لوگ جو اس سے زیادہ توضیحات کے خواہاں ہیں اور حضرت علی علیہ السلام، اہل بیتؑ، صحابہؓ اور غیر صحابہ کی طرف سے حدیث غدیر سے استدلال کرنے کے بارے میں ان روایات کے مختلف ماخذ کے بیان سے آگاہ ہونا چاہیں تو وہ کتاب الغدیر جلد اول صفحہ 59 تا 213 کی طرف رجوع کریں۔ علامہ امینی مرحوم نے صحابہؓ و غیر صحابہ میں سے 22 حضرات سے مختلف مواقع پر اس حدیث سے استدلال کرنے کی روایات پیش کی ہیں۔

5. آیت کے آخری جملہ کا مفہوم کیا ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ اگر یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کو خلافت اور ولایت کا منصب عطا کرنے اور واقعہ غدیر سے متعلق ہے تو پھر یہ آخری جملہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْن "خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا" کا اس مسئلے سے کیا ربط ہے؟

اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے بس اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ لفظ کفر لغت اور قرآن کی زبان میں انکار، مخالفت اور ترک کے معنی میں ہے۔ کبھی انکار خدا یا انکار نبوت پیغمبرؐ کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی دوسرے احکام کے مقابلے میں انکار یا مخالفت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

سورۃ آل عمران 3 آیت 97 میں حج کے بارے میں ہے:

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اور جس نے باوجود قدرت حج سے انکار کیا تو خدا سارے جہان سے بے پرواہ ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت 102 میں ہے:

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ط حالانکہ یہ دونوں فرشتے کسی کو سکھاتے نہ تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم دونوں تو ذریعہ آزمائش ہیں پس تم (اس پر عمل کرکے) کافر نہ ہو جانا۔

سورۃ ابراہیم آیت 22 میں بھی ہے کہ شیطان ان لوگوں کے مقابلے میں جنہوں نے اس کی پیروی اور اطاعت کی قیامت کے دن صریحاً اظہار نفرت کرتے ہوئے ان سے کہے گا کہ تم نے احکام الٰہی کی اطاعت میں مجھے اس کا شریک قرار دیا تھا اور میں آج تمہارے اس کام سے کفر کرتا ہوں۔ "**اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ**" (سورۃ ابراہیم 14 آیت 22) میں اس سے پہلے ہی بیزار ہوں کہ تم نے مجھے (خدا کا) شریک بنایا۔

اس بنا پر کفر کا اطلاق مسئلہ ولایت کے مخالفین پر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

6. کیا ایک ہی زمانے میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟

ایک اور بہانہ جو اس متواتر حدیث اور اسی طرح زیر بحث آیت سے روگردانی کے لئے کیا گیا ہے یہ ہے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حضرت علی علیہ السلام کو غدیر خم میں ولایت و رہبری اور خلافت کے لئے مقرر کر دیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی زمانہ میں دو رہبر اور دو پیشوا ہو جائیں گے۔

لیکن اس آیت کے نزول اور حدیث کے دور کے زمانہ کے شرائط اور مخصوص حالات و کوائف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی طرح ان قرائن پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بہانہ بھی کلی طور پر برطرف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کے آخری

مہینوں میں واقع ہوا ہے جب آپؐ آخری احکام لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ خصوصاً جب آپؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ میں بہت جلدی تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں اور دوگراں قدر چیزیں تمہارے درمیان چھوڑ رہا ہوں۔

جو شخص یہ گفتگو کر رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے جانشین کے مقرر کرنے کے انتظام میں مصروف ہے اور وہ آئندہ کے لئے پروگرام دے رہا ہے نہ کہ اپنے زمانے کے لئے۔ لہٰذا اس سے صاف واضح اور روشن ہے کہ اس سے دو پیشواؤں کا ایک ہی زمانہ میں ہونا مقصود نہیں ہے۔

وہ بات جو خاص طور پر لائق توجہ ہے ایک طرف تو بعض علماء اہل سنت یہ اعتراض پیش کر رہے ہیں لیکن دو ایسے ہیں جنہوں نے اس کے مقابلے میں ایک اور اعتراض پیش کر دیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت وخلافت کے منصب پر تقرری تو کی ہے مگر اس کی تاریخ صاف اور واضح طور پر بیان نہیں فرمائی۔ اس صورت میں کیا رکاوٹ ہے کہ یہ ولایت وخلافت علیؑ کا بیان دوسرے تین خلفاء کے بعد کے لئے ہو۔

حقیقتاً کتنی حیرت کی بات ہے کہ کوئی چھت کے اِس طرف گر رہا ہے اور کوئی اُس طرف۔ اس واقعہ کو مان لینے میں تعصّبات حائل ہو گئے ہیں۔ ذرا کوئی ان سے یہ پوچھے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم یہ جانتے تھے کہ اپنے چوتھے خلیفہ کو معین کریں اور مسلمانوں کے لیے آئندہ کی فکر تھی تو کیوں آپؐ نے پہلے دوسرے اور تیسرے کا ذکر جس کا تعین چوتھے خلیفہ پر مقدم ولازم تھا غدیر خم کے خطبہ میں نہ فرمایا۔

خلاصہ

☆ آیت کے جملوں کی بندش، اس کا مخصوص لب و لہجہ اور اس میں پے در پے تاکیدوں پر تاکیدیں اور آیت کا یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ سے شروع ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گفتگو کسی ایسے اہم امر کے متعلق ہو رہی ہے جس کی تبلیغ نہ کرنا کوئی بھی کارِ رسالت سر انجام نہ دینے کے برابر ہے۔

☆ بلاشبہ پیغمبرؐ کی پریشانی اپنی ذات اور نفس کے لئے نہیں تھی بلکہ مخالفین کی طرف سے ان احتمالی مخالفتوں کے بارے میں تھی جن کا نتیجہ مسلمانوں کے لئے خطرات اور نقصانات کی صورت میں نکلتا۔

☆ وہ بہت سی روایات جو واقعہ غدیر کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ سب کی سب ایک ہی واقعہ کے گرد گھومتی ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم کے مقام پر ایک مفصل خطبے میں حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان کیا۔ حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف سے مبارک باد دی گئی۔

☆ عرب کے مشہور شاعر مداح رسولؐ حسان بن ثابتؓ نے پیغمبرؐ سے اجازت لے کر اس موقع کی مناسبت سے ایک قصیدہ پڑھا۔

جرح وتنقید اوراعتراضات:

دو قسم کے لوگ ہیں جنہوں نے اس آیت کے واقعہ غدیر کے متعلق ہونے سے اختلاف کیا ہے۔پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو نہ صرف دشمنی اور ہٹ دھرمی سے اس پر بحث کرتے ہیں بلکہ انہوں نے شیعوں کی ہتک وتوہین اور بدگوئی کا راستہ اختیار کیا ہے۔اس گروہ کا واضح نمونہ ابن تیمیہ ہے۔اس نے اپنا مؤقف کتاب منہاج السنۃ میں بیان کیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے تحقیق کی، کسی حد تک حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے حقائق کے ایک حصے کا اعتراف کرلیا ہے لیکن اس آیت اور اس سے مربوط روایات بیان کرنے سے پہلے کچھ اشکالات بیان کیے۔وہ اشکالات شاید ان خاص حالات کا نتیجہ تھے جو ان کے فکری ماحول پر محیط تھا۔

1. کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے؟

کئی وجوہات کی بنا پر یہاں مولیٰ کا معنی دوست نہیں لیا جاسکتا بلکہ مولا بمعنی اولیٰ ہے۔مولا کا لفظ اس معنی کے لحاظ سے ہر اس پر بولا جاتا ہے جو کوئی بلند مرتبہ اور مقام رکھتا ہو جس کے حکم کی اطاعت کی جائے اور اس کا امر نافذ اور واجب العمل ہو۔

2. آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط کیا ہے؟

اس آیت کا لب ولہجہ اور اس کا قبل وبعد کی آیات سے فرق مکمل طور پر یہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس آیت کا موضوع کوئی ایسی چیز ہے جو قبل وبعد کی آیات سے مختلف ہے۔

دوسری بات یہ ہے۔قرآن ایک کلاسیکی کتاب نہیں ہے کہ جس کے مطالب کو

خاص حصوں اور ابواب میں ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہو بلکہ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی اور مختلف حادثات و واقعات رونما ہوتے گئے ان کے مطابق نازل ہوتا رہا۔

3. یہ حدیث تمام کتب صحاح میں نقل کیوں نہیں ہوئی ہے؟

یہ اعتراض بھی عجائبات میں سے ہے کیونکہ اول تو بہت سی معتبر احادیث ایسی ہیں جنہیں علمائے اہل سنت نے قبول کیا ہے۔ حالانکہ وہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں نہیں ہیں۔ کیا ان کے نزدیک صرف یہی دو کتابیں معتبر ہیں حالانکہ یہ حدیث ان کے قابل اعتماد منابع اور کتب میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ صحاح ستہ مثلاً سنن ابن ماجہ میں یہ حدیث موجود ہے اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں بھی یہ حدیث آئی ہے۔ اور حاکم، ذہبی اور ابن حجر جیسے علماء نے بھی اس حدیث کے بہت سے طرق کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

4. حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ نے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا؟

اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں ایسے بہت سے مواقع کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہاں پر خود حضرت علی علیہ السلام نے یا آئمہ اہل بیتؑ نے یا اس مسلک سے تعلق رکھنے والوں نے حدیث غدیر سے استدلال کیا ہے۔

5. آیت کے آخری جملہ کا مفہوم کیا ہے؟

لفظ کفر لغت میں بھی اور اسی طرح قرآن کی زبان میں بھی انکار، مخالفت اور ترک کے معنی میں ہے۔ کبھی انکار خدا یا انکار نبوت پیغمبرؐ کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی دوسرے احکام کے مقابلے میں انکار یا مخالفت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس بنا پر کفر کا اطلاق مسئلہ ولایت اور رہبری کے مخالفین پر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

6. کیا ایک ہی زمانے میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟

غدیر خم کا واقعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کے آخری مہینوں کا ہے جب آپؐ آخری احکام لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ اپنا جانشین مقرر کرنے کے انتظام میں مصروف تھے اور آئندہ کے لئے پروگرام دے رہا تھے نہ کہ اپنے زمانے کے۔ لہٰذا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دو پیشواؤں کا ایک ہی زمانہ میں ہونا آپ کی مراد نہ تھی۔

اگر پیغمبرؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت وخلافت کے منصب پر تقرری پہلے تینوں خلفاء کے بعد کرنا مقصود ہوتی تو آپ پہلے تینوں خلفاء کا ذکر ضرور کرتے۔ اس سے یہ بالکل واضح ہے کہ بلافصل جانشین پیغمبرؐ، وصیِ رسولؐ صرف اور صرف حضرت علیؑ ہی ہیں۔

خود آزمائی

1. قرآن مجید میں حضورؐ کو یا ایھاالرسول سے کتنے مقامات پر خطاب کیا گیا ہے؟

2. وہ کون سا ایسا مقصد تھا جس کے پہنچانے کے لیے خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو اتنی تاکید کے ساتھ حکم دیا ''وان لم تفعل فما بلغت رسالته'' ؟

3. آیت تبلیغ کا شان نزول بیان کریں اور معتبر کتب کے حوالہ جات بھی دیں؟

4. واقعہ غدیر کا خلاصہ بیان کریں؟

5. خم غدیر کے عظیم موقع پر کن معروف ہستیوں نے حضرت علی علیہ السلام کو ولایت کے اعلان پر مبارک باد دی؟

6. اعلان غدیر کے موقع پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ایک قصیدہ کہا اس کے کوئی سے دو اشعار زبانی سنائیں؟

7. ان دو اقسام کے لوگوں کا ذکر کریں جنھوں نے آیت تبلیغ کو حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کے بارے میں اختلاف کیا ہے؟

8. کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے وضاحت کریں؟

9. اگر آیت تبلیغ ''یا ایھاالرسول بلغ ....'' سے قبل اور بعد کی آیات کا جائزہ لیں تو یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی ولایت پر کیسے دلالت کرتی ہے؟

10. حدیث غدیر کتب صحاح ستہ میں نقل کیوں نہیں ہوئی؟

11. حضرت علی علیہ السلام نے حدیث غدیر سے اپنی خلافت کا استدلال کیوں نہیں کیا؟

12. آیت کے آخری جملے ''ان الله لایھدی .....'' کا مفہوم بیان کریں؟

13. کیا ایک زمانے میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟

12

آیت اکمال دین

اَلۡیَوۡمَ یَئِسَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ دِیۡنِکُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ (سورۃ المائدہ5 آیت3 پارہ6)

ترجمہ: آج کے دن وہ لوگ جو کافر ہوئے تمہارے دین سے (پھر جانے سے) مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے (ہی) ڈرو۔ آج کے دن میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔

تفسیر

آیت میں یہ دونوں جملے معنی خیز ہیں:

(i) آج کے دن کافر تمہارے دین سے نا آمید ہو گئے۔ پس ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔

(ii) آج کے دن میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

آیت کے دونوں جملوں میں " الیــوم" سے مراد کون سا دن ہے جس میں یہ چار پہلو جمع ہو گئے۔

(i) کفار اس دن نا آمید ہوئے۔

(ii) دین مکمل ہو گیا۔

(iii) نعمت الٰہی پوری ہو گئی۔

(iv) خدا نے دین اسلام کو تمام لوگوں کے لئے آخری دین کے طور پر پسند کر لیا۔

مفسرین کا اس میں بہت اختلاف ہے۔ لیکن جس بات میں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ ایسا دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی میں بہت اہم ہونا چاہیے۔ یہی وجہ

ہے کہ کئی ایک روایات میں آیا ہے کہ بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ اگر ایسی آیت ہماری آسمانی کتب میں ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن قرار دیتے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم قرائن، نشانیوں، آیت اور سورۃ کے نزول کی تاریخ، پیغمبرؐ کی زندگی کی تاریخ اور مختلف اسلامی منابع کی روایات سے اس اہم دن کو تلاش کریں۔

کیا اس سے مراد حلال و حرام گوشت کے نزول کا دن ہے؟

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ط ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ لا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

''حرام کیا گیا تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ (جانور) جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹ کر مرا ہوا اور چوٹ کھا کر مرا ہوا اور بلندی سے گر کر مرا ہوا اور سینگ لگ کر مرا ہوا اور وہ جسے درندہ نے کھایا ہو سوائے اس کے جسے تم نے (مرنے سے پہلے) ذبح کر لیا اور وہ (جانور) جو (بتوں کے) تھان پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور یہ کہ تم تیروں کے ساتھ قسمت معلوم کرو۔ یہ نافرمانی ہے۔ وہ لوگ جو کافر ہوئے آج کے دن تمہارے دین سے ناامید ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔ میں نے آج کے دن تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر

پوری کردی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔ پس جو شخص بھوک میں بے قرار ہو جائے۔ (لیکن) گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو۔ تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔"

آیت میں مندرجہ بالا احکام کا نزول اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہے اور نہ ہی یہ تکمیل دین کا باعث ہے۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے آخری پیغامات بھی نہ تھے کیونکہ اس سورۃ کے آخر میں کچھ اور احکام بھی دکھائی دیتے ہیں اور پھر ان احکام کا نزول کفار کی ناامیدی کا سبب بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بات جو کفار کی مایوسی کا سبب بن سکتی ہے وہ اسلام کے مستقبل کے لئے کوئی محکم بنیاد اور سہارا ہونا چاہیے۔

کیا اس سے مراد پیغمبرؐ کے حجۃ الوداع کے عرفہ کا دن ہے جیسا کہ مفسرین کے ایک گروہ نے احتمال ظاہر کیا ہے؟[1]

اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ مذکورہ بالا نشانیاں اس دن میں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی اس دن کوئی ایسا واقعہ نمودار ہوا ہے جو کفار کی مایوسی کا باعث بن سکے۔ اگر اس سے مراد مسلمانوں کا عظیم اجتماع ہے تو وہ روز عرفہ سے پہلے بھی مکہ میں خدمتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں واقع ہوا تھا۔

کیا اس سے فتح مکہ کا دن مراد ہے؟[2]

جبکہ اس سورۃ کے نزول کا زمانہ فتح مکہ سے بہت ہی بعد کا ہے۔

[1] تفسیر المنار جلد 6 صفحہ 155 [2] تفسیر المنار جلد 6 صفحہ 157

کیا سورۃ برائت کی آیات کے نزول کا دن ہے؟ [1]

حالانکہ سورۃ برائت کی آیات کے نزول کا دن اس سورۃ کے نزول سے کافی مدت پہلے تھا۔

کیا اس دن سے مراد ظہور اسلام یا بعثت پیغمبرؐ کا دن ہے؟

جبکہ ان دونوں کا اس آیت کے نزول کے دن سے کوئی ربط نہیں ہے اور ان کے درمیان ایک طویل مدت حائل ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا چھ احتمالات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو آیت کے مفہوم سے مناسبت رکھتا ہو۔

کیا اس دن سے مراد غدیر خم کا دن ہے؟

یہ احتمال جسے شیعہ سنی مفسرین نے اپنی کتب میں پیش کیا ہے۔ متعدد روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ نیز آیت کے مضامین بھی اس سے مناسبت رکھتے ہیں کہ اس دن سے مراد غدیر خم کا دن ہے۔

جس روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو باقاعدہ اپنی جانشینی کیلئے مقرر کیا تھا۔ یہی روز تھا جب کفار مایوسیوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ کیونکہ انہیں توقع تھی کہ دین اسلام کا قیام بس ایک شخص سے مربوط ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعد صورت حال پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آئے گی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ایک ایسا شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی جانشینی کے لئے منتخب ہوا ہے

[1] الدر المنثور، سیوطی، جلد 2 صفحہ 258

جو علم وتقویٰ اور قدرت وعدالت کے لحاظ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعد بے نظیر ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے لوگوں سے اس کی بیعت لے لی ہے تو وہ اسلام کے بارے میں یاس وناامیدی کا شکار ہوگئے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس دین کی جڑیں مضبوط اور پائیدار ہیں۔ یہ وہ دن تھا جب دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ کیونکہ جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے تعین اور مسلمانوں کا مستقبل واضح ہوئے بغیر یہ آخری تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھا جب نعمت الٰہی حضرت علی علیہ السلام جیسے لائق رہبر کے تعین کے ذریعے لوگوں کے مستقبل کے لئے پوری ہوگئی۔ اسی دن اسلام اپنے پروگرام کی تکمیل کے ذریعے آخری دین کے طور پر خدا کی طرف سے پسندیدہ قرار پایا۔ لہٰذا اس میں چاروں مذکورہ پہلو موجود تھے۔

مندرجہ ذیل قرائن [1] بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

(الف) تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبرؐ اکیاسی دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔ [2]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات اہل سنت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وفات بارہ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زیر نظر آیت کے نزول کا دن ٹھیک اٹھارہ ذی الحجہ ہے۔

(ب) بہت سی روایات جو مشہور شیعہ سنی طرق سے منقول ہیں کے مطابق زیر

[1] قرینہ کی جمع ہے معنی مناسبت۔ [2] البتہ یہ اس صورت میں جب خود روزِ وفات پیغمبر اور روزِ غدیر کو شمار نہ کیا جائے نیز تین مہینوں میں یک بعد دیگر ہر مہینہ 29 دن کا ہو اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روز غدیر سے پہلے ان میں چند ایک یہ ہیں اور بعد تاریخ اسلام میں کوئی ایسا اہم واقعہ رونما نہیں ہوا جس پر مندرجہ بالا تاریخ منطبق ہو سکے اس لیے حتماً غدیر کے علاوہ اس سے کوئی اور دن مراد نہیں

بحث آیہ غدیر خم کے روز اور ولایت حضرت علی علیہ السلام کے اعلان کے بعد نازل ہوئی۔

(i) مشہور سنی عالم ابن جریر طبری کتاب ولایت میں معروف صحابی زید بن ارقمؓ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے دن حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی۔

(ii) حافظ ابو نعیم اصفہانی اپنی کتاب "مَا نُزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ فِیْ عَلِیٍّؑ" میں مشہور صحابی ابو سعید خدریؓ سے نقل کرتے ہیں۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے غدیر کے دن لوگوں سے حضرت علی علیہ السلام کا تعارف ان کی ولایت کے حوالے سے کروایا اور لوگ ابھی منتشر نہیں ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی: **الیوم اکملت لکم دینکم**... اس موقع پر رسولؐ اللہ نے فرمایا:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى اِكْمَالِ الدِّيْنِ وَاِتْمَامِ النِّعْمَةِ وَرَضِيَ الرَّبُّ بِرِسَالَتِيْ وَ بِالْوَلَايَةِ لِعَلِيٍّ مِنْ بَعْدِيْ ، ثُمَّ قَالَ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ ، اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ.

"اللہ اکبر دین کی تکمیل پر اور نعمت تمام ہونے پر اور پروردگار کے میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر راضی اور خوش ہونے پر۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: جس شخص کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔ خدایا ! اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور جو اسے چھوڑ دے تو بھی اسے چھوڑ دے۔"

(iii) خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے نقل کرتے ہیں۔ واقعہ غدیر خم، ولایت علیؑ کے عہد و پیمان اور حضرت عمرؓ کے "**بَخٍ بَخٍ يَا ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلَا كُلِّ مُسْلِمٍ**"[1] کہنے

[1] حضرت عمرؓ کی اس بات کا مطلب ہے کیا کہنے اے فرزند ابو طالب آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے

کے بعد آیہ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی۔

کتاب ''الغدیر'' میں مذکورہ تینوں روایات کے علاوہ اس سلسلے میں مزید تیرہ روایات نقل کی گئی ہیں۔کتاب احقاق الحق میں تفسیر ابن کثیر جلد 2 صفحہ 14 اور مقتل خوارزمی صفحہ 47 کے حوالے سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے منقول ہے کہ یہ آیت واقعہ غدیر کے بارے میں نازل ہوئی۔تفسیر برہان اور تفسیر نور الثقلین میں بھی مختلف طرق سے اس سلسلے میں دس روایات نقل ہوئی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں یا غدیر خم کے دن کے بارے میں نازل ہوئی۔ان سب روایات کو نقل کرنے کیلئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔[1]

علامہ سید شرف الدین مرحوم کتاب المراجعات جلد 4 صفحہ 38 میں لکھتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول صحیح روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی۔اہل سنت نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے اس سلسلے میں مختلف اسناد سے چھ روایات نقل کی ہیں جو اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے ضمن میں نازل ہوئی۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر آیت کے واقعہ غدیر کے سلسلے میں نازل ہونے کے بارے میں موجود روایات ایسی نہیں ہیں کہ انہیں خبر واحد کہا جا سکے اور ان کی بعض اسناد کو ضعیف قرار دے کر ان سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔

بعض متعصب مؤلفین و مصنفین حضرات چونکہ ان روایات کو اپنے ذوق کے خلاف پاتے ہیں۔لہذا انہیں مجہول اور غلط قرار دیتے ہیں مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں صرف ایک سند کو ضعیف قرار دے کر کوشش کی ہے کہ باقی روایات کو بھی نظر انداز کر دے

[1] تفسیر برہان جلد اول اور تفسیر نور الثقلین جلد اول میں زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

تفسیر المنار کے مؤلف آیت کی ایک عام تفسیر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں ۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان روایات کی طرف ذرا اشارہ بھی نہیں کیا ۔شاید وہ اس مخمصے میں تھے کہ اگر روایات کا ذکر کر کے انہیں ضعیف قرار دیں تو خلاف انصاف ہوگا اور اگر قبول کر لیں تو خلافِ ذوق ہوگا۔

ایک اہم نکتہ جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ قرآن حکیم سورۃ نور 24 آیت 55 میں کہتا ہے۔ وَعَدَاللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا. ’’تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہیں خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا۔جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے۔اس پر انہیں ضرور پوری قدرت دے گا اور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دین ان کے لئے پسند کیا ہے اسے زمین پر مستحکم و پائیدار کرے گا۔ یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ سورۃ نور سورۃ مائدہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور ’’رضیت لکم الاسلام دینا ‘‘ کے جملے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت میں ولایت علیؑ کے بارے میں نازل ہوا ہے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام اس صورت میں زمین پر مستحکم ہوسکتا ہے جب ’’ولایت‘‘ کے ساتھ منسلک ہو کیونکہ یہ وہی اسلام ہے جسے خدا نے ’’پسند‘‘ کیا ہے اور اس کے استحکام کا وعدہ کیا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اسلام اسی صورت میں عالم گیر ہوسکتا ہے جب وہ ولایت اہل بیتؑ کے مسئلے سے جدا نہ ہو۔

سورہ نور کی مذکورہ آیت اور زیر بحث آیت کو غور سے دیکھنے سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ سورۃ نور کی آیت میں باایمان افراد سے تین وعدے کیے گئے ہیں:

پہلا : زمین پر خلافت۔

دوسرا : پروردگار کی عبادت کے لئے امن وامان۔

تیسرا : اس دین کا استحکام جو خدا کا پسندیدہ ہے۔

یہ تین وعدے غدیر خم کے روز آیت **الیوم اکملت لکم دینکم** کے نزول کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ کیونکہ ایمان و عمل صالح کا کامل نمونہ یعنی حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی جانشینی کے لئے مقرر ہوئے "**الیوم یئس الذین کفروا من دینکم**" کے ذریعے مسلمانوں کو نسبتاً امن نصیب ہوا۔ نیز "**ورضیت لکم الاسلام دینا**" کے ذریعے پروردگار کا پسندیدہ دین مسلمانوں میں مستحکم ہوا۔

البتہ یہ تفسیر ان روایات کے منافی نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ سورۃ نور کی یہ آیت حضرت امام مہدیؑ (عج) کی شان میں نازل ہوئی ہے کیونکہ "**امنوا منکم**" کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ جس کا ایک نمونہ غدیر خم کے دن انجام پایا اور پھر ایک وسیع تر سطح حضرت امام مہدیؑ (عج) کے قیام کے وقت انجام پائے گا۔ اس بناء پر "**الارض**" آیت میں تمام کرہ زمین کے لئے نہیں بلکہ اس کا بھی ایک عمومی مفہوم ہے۔ یعنی اس لفظ کا استعمال تمام زمین کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور اس کے ایک حصے کیلئے بھی جیسا کہ قرآن میں مختلف مواقع پر اس کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ زمین کے ایک حصے کے لئے ہے اور بعض اوقات پورے کرۂ ارض کے لئے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب:

واقعہ غدیر کے متعلق پیش کی جانے والی دونوں آیات کے درمیان فاصلہ کیوں رکھا

گیا ہے۔ **اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ...** سورۃ مائدہ کی تیسری آیت ہے اور **یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک...** سورۃ مائدہ کی 67 آیت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آیت کا یہ حصہ جو واقعہ غدیر سے مربوط ہے ایسے مطالب سے منسلک کیا گیا ہے جو حلال وحرام گوشت کے بارے میں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔[1]

اس کا جواب یہ ہے:

اوّلاً ہم جانتے ہیں کہ قرآنی آیتیں اور اسی طرح سورتیں تاریخ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں بلکہ مدینہ میں نازل ہونے والی بہت سی سورتوں میں مکی آیات ہیں اور اس کے برعکس مکی سورتوں میں مدنی آیتیں موجود ہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دو آیات کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے[2] اگر تاریخ نزول کے مطابق آیات جمع کی گئی ہوتیں اور پھر یہ فاصلہ ہوتا تو اعتراض کیا جا سکتا تھا۔

ثانیاً: ممکن ہے کہ غدیر سے مربوط آیت کو حلال وحرام غذاؤں سے متعلق آیت میں تحریف، حذف اور تغیر سے محفوظ رکھنے کے لئے ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفیس چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے عام سی چیزوں میں ملا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی طرف توجہ کم ہو۔

وہ حوادث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی کے آخری لمحات میں رونما ہوئے اور بعض افراد نے آپ کی طرف سے وصیت نامہ لکھے جانے کی واضح مخالفت کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ (نعوذ باللہ) حتیٰ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بارے میں کہا گیا انہیں ہذیان ہو گیا ہے اور وہ یہ سب باتیں بیماری کے عالم میں کہہ رہے ہیں۔

[1] یہ سوال تفسیر المنار میں اس آیت سے مربوط مباحث میں اشارۃً مذکور ہے۔ [2] البتہ ہر سورت کی آیات کو فرمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے تحت رکھا گیا ہے)

رسولؐ اللہ کو ایسی ایسی ناموزوں تہمتیں لگائی گئیں۔اس واقعے کی تفصیل اسلامی دنیا کی مشہور کتب میں موجود ہے اور شیعہ سنی دونوں کی اہم کتب میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ [1]

یہ واقعہ اس سلسلے میں شاہد ہے کہ بعض لوگ مسئلہ خلافت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی جانشینی کے معاملے میں بہت حساس تھے اور وہ اس کے انکار کے لئے ہر انتہائی قدم اٹھانے کو تیار تھے۔تو کیا ایسے حالات میں ضروری نہیں تھا کہ خلافت سے مربوط اسناد کی حفاظت کی جاتی اور انہیں آنے والے لوگوں تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام کیا جاتا اور اسے عام مطالب کے ساتھ ملا کر بیان کیا جاتا کہ سخت مخالفین زیادہ متوجہ نہ ہوں۔

ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ "الیوم اکملت لکم دینکم" کے غدیر اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی جانشینی کے متعلق نزول سے مربوط اسناد صرف شیعہ کتب میں موجود نہیں ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض ہو۔ بلکہ اہل سنت کی بہت سی کتب میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔

[1] یہ حدیث اہل سنت کی مشہور ترین کتاب صحیح بخاری میں کئی مقامات پر نقل ہوئی ہے ان میں سے کتاب المرخی جزء 4 میں کتاب العلم جزو اول صفحہ 22 کتاب الجہاد، باب جوائز وفدس صفحہ 118 جزء 2 میں بھی موجود ہے۔اسی طرح یہ روایت کتاب صحیح مسلم جز 2 دو میں آخری وصیتوں کے زیر عنوان صفحہ 14 پر موجود ہے علاوہ ازیں دیگر کتب میں بھی یہ روایت موجود ہے سید شرف الدین مرحوم نے المراجعات میں "رزیہ یوم الخمیس" کے زیر عنوان یہ روایات نقل کی ہیں۔

خلاصہ

آیت کے دونوں جملوں میں چار پہلو :

(i) کفار اس دن نا آمید ہو گئے۔

(ii) دین مکمل ہو گیا۔

(iii) نعمت الٰہی پوری ہو گئی۔

(iv) خدا نے دین اسلام کو تمام لوگوں کے لئے آخری دین کے طور پر پسند کر لیا

الیوم سے مراد :

(i) حلال وحرام گوشت کے احکام کے نزول کا دن

(ii) حجۃ الوداع کے عرفہ کا دن

(iii) فتح مکہ کا دن

(iv) سورۃ برأت کی آیات کے نزول کا دن

(v) ظہور اسلام کا دن

(vi) بعثت پیغمبرؐ کا دن

مذکورہ بالا 6 احتمالات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو آیت کے مفہوم سے مناسبت رکھتا ہو۔

(vii) غدیر خم کا دن

یہ احتمال جو شیعہ سنی مفسرین نے اپنی کتب میں پیش کیا ہے۔متعدد روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں ۔نیز آیت کے مضامین بھی اس سے مناسبت رکھتے ہیں کہ اس دن سے مراد غدیر خم کا دن ہے۔

سورۃ نور آیت 55 میں باایمان افراد سے تین وعدے کیے گئے ہیں:

(i) زمین پر خلافت

(ii) پروردگار کی عبادت کے لئے امن وامان

(iii) خدا کے پسندیدہ دین کا استحکام

یہ تینوں وعدے غدیر خم کے روز آیت **الیوم اکملت لکم دینکم** کے نزول کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے۔

سورۃ نور کی آیت "امنوا منکم "کا ایک وسیع مفہوم ہے۔جس کا ایک نمونہ غدیر خم کے دن انجام پایا اور پھر ایک وسیع تر سطح حضرت امام مہدیؑ (عج) کے قیام کے وقت انجام پائے گا۔اسی طرح "الارض" کا بھی ایک عمومی مفہوم ہے یعنی تمام زمین کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ایک حصے کیلئے بھی۔

واقعہ غدیر سے مربوط دونوں آیات کے درمیان فاصلہ کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

اوّلاً: قرآنی آیتیں اور سورتیں تاریخ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں۔

ثانیاً: ممکن ہے کہ غدیر سے مربوط آیت کو حلال وحرام غذاؤں سے متعلق آیت میں تحریف، حذف اور تغیر سے محفوظ رکھنے کے لئے بیان کیا گیا ہو۔

خود آزمائی

1. آیت ''الیوم اکملت لکم......'' میں ''الیوم'' سے کونسا دن مراد ہے اور اس کے متعلق مفسرین کے اختلافات کا ذکر بھی کریں؟

2. آیت ''الیوم اکملت لکم...'' کے دو جملوں میں کون سے چار پہلو بیان ہوئے ہیں۔

3. سورۃ نور کی آیت وعد اللہ الذین .... میں کون سے تین وعدے کیے گئے تھے اور وہ کب پورے ہوئے ؟

4. سورۃ نور کی آیت وعد اللہ الذین ... میں '' امنوا منکم'' سے مراد حضرت امام زمانہ (عج) علیہ السلام کی خلافت ہے تو آپ اس سے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کیسے مراد لے سکتے ہیں؟

5. سورۃ نور کی آیت وعد اللہ الذین .... میں لفظ ''الارض'' کا مفہوم بیان کریں؟

6. اگر یا ایھاالرسول بلغ... اور الیوم اکملت لکم... دونوں آیات کا تعلق غدیر خم کے واقعہ سے ہے تو پھر ان دونوں آیات کے درمیان فاصلہ کیوں ہے؟

7. ثابت کریں کہ دین کی تکمیل حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان سے ہوئی؟

8. علامہ سید شرف الدین نے اپنی کتاب المراجعات میں آیت اکمال الدین کا شان نزول کیا بیان کیا؟

9. تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار کا یہ بیان کہ آیت الیوم الملت لکم کے نزول کے بعد پیغمبرؐ اکیاسی دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے سے آپ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم میں نازل ہوئی؟

10. حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کے فوراً بعد حضورؐ نے کیا دعا کی؟

﴿ حصّہ دوّم ﴾

موضوعات

1. ہرامت میں ہادی کی ضرورت ہے
2. آنحضرتؐ کے اعلان نبوت سے پہلے مومن موجود تھے
3. من دون اللہ وغیر اللہ
4. ایمان آباؤاجداد معصومین
5. نبوت ورسالت وخلافت وامامت ووزارت خدا کی طرف سے ہے
6. اللہ کے سواوسیلہ کے انتخاب کاحق کسی کونہیں
7. نبوت ورسالت وامامت ذریت میں
8. عام انسان اور نبیؐ وامامؑ کی ولادت میں فرق
9. نبوت وامامت صغرسنی میں
10. انبیاءورسلؑ اورآئمہ طاہرینؑ کاعلم خدا کی طرف سے
11. نبی اورامام صرف بشرہیں یافوق البشر بھی
12. عصمتِ انبیاءؑ و آئمہؑ
13. خدااوررسولؐ وامامؑ کاحکم ایک ہی ہے
14. درود و سلام

﴿ حصّہ دوّم ﴾

موضوعات

1. ہر امت میں ہادی کی ضرورت ہے
2. آنحضرتؐ کے اعلان نبوت سے پہلے مومن موجود تھے
3. من دون اللہ و غیر اللہ
4. ایمان آباؤ اجداد معصومین
5. نبوت و رسالت و خلافت و امامت ووزارت خدا کی طرف سے ہے
6. اللہ کے سوا وسیلہ کے انتخاب کا حق کسی کو نہیں
7. نبوت و رسالت و امامت ذریت میں
8. عام انسان اور نبیؑ و امامؑ کی ولادت میں فرق
9. نبوت و امامت صغرسنی میں
10. انبیاء و رسلؑ اور آئمہ طاہرینؑ کا علم خدا کی طرف سے
11. نبی اور امام صرف بشر ہیں یا فوق البشر بھی
12. عصمتِ انبیاءؑ و آئمہؑ
13. خدا اور رسولؐ و امامؑ کا حکم ایک ہی ہے
14. درود و سلام

13

آیت رؤیت اعمال

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ o

(سورۃ توبہ آیت 105 پارہ 11)

ترجمہ: (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ تم لوگ اپنے اپنے کام کیے جاؤ۔ ابھی تو خدا اور اس کا رسولؐ اور مؤمنین تمہارے کاموں کو دیکھیں گے اور تم ظاہر و باطن کے جاننے والے خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ تب جو کچھ بھی تم کرتے تھے تمہیں بتا دے گا۔

تفسیر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو اس امر کی تبلیغ کریں اور کہیں کہ اپنے اعمال اور ذمہ داریاں انجام دو اور جان لو کہ خدا، اس کا رسولؐ اور مومنین تمھارے اعمال کو دیکھیں گے۔

یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی یہ تصور نہ کرے کہ اگر وہ کسی خلوت (تنہائی) کے مقام پر یا کسی جماعت کے اندر کوئی عمل انجام دیتا ہے تو وہ علم خدا سے اوجھل رہ جاتا ہے بلکہ خدا کے علاوہ پیغمبرؐ اور مؤمنین بھی اس سے آگاہ ہیں۔

اس حقیقت کی طرف توجہ اور اس پر ایمان رکھنا، اعمال اور نیتوں کے پاک رہنے کے لیے بہت مؤثر ہے۔ عام طور پر اگر انسان یہ احساس کرے کہ اسے ایک آدمی دیکھ رہا ہے تو وہ اپنی کیفیت ایسی بنالے گا جو قابل اعتراض نہ ہو۔ چہ جائیکہ اسے یہ احساس ہو کہ خدا اور رسولؐ اور مومنین اس کے اعمال سے باخبر ہیں۔ یہ آگاہی جزا یا سزا کا مقدمہ ہے جو اگلے جہان میں اس کے انتظار میں ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اس جملے کا اضافہ کیا گیا ہے:

عنقریب تم ایسی ہستی کی طرف لوٹ جاؤ گے جو غیب اور ظاہر سے آگاہ ہے اور وہ تمھیں تمہارے کیے ہوئے عمل کی خبر دے گا اور اس کے مطابق جزا دے گا **و ستردون الیٰ علم الغیب و الشهادة فینبئکم بما کنتم تعملون۔**

چند اہم نکات

1. اعمال پیش ہونے کا مسئلہ :

بہت سی روایات اور خبریں جو آئمہؑ سے پہنچی ہیں ان کے پیش نظر مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کا مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰؑ تمام امت کے اعمال سے آگاہ ہو جاتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ مخصوص طریقوں سے امت کے اعمال ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں منقول روایات بہت زیادہ ہیں اور شاید حد تواتر تک ہوں ۔ ہم نمونے کے طور پر ان میں سے مختلف قسم کی چند روایات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(i) حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ اَعْمَالُ الْعِبَادِ کُلَّ صَبَاحٍ، اَبْرَارُهَا وَفُجَّارُهَا فَحْذَّهَا وَ هُوَ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَکُمْ وَ رَسُوْلُهُ وَسَکَتَ۔

لوگوں کے تمام اعمال ہر روز صبح کے وقت رسولؐ خدا کے سامنے پیش ہوتے ہیں چاہے وہ نیک لوگوں کے اعمال ہوں یا برے لوگوں کے۔ لہٰذا متوجہ رہو (اور اس سے ڈرو) اور خدا تعالیٰ کے ارشاد "و قل اعملوا فسیری الله عملکم و رسوله" کا یہی مفہوم ہے یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ [1]

(ii) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک اور حدیث منقول ہے جس میں

[1] اصول کافی جلد 1 صفحہ 171 باب عرض الاعمال

آپؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْاَعْمَالَ تُعْرَضُ عَلٰی نَبِیِّکُمْ کُلَّ عَشِیَّةِ الْخَمِیْسِ فَلْیَسْتَحِ اَحَدُکُمْ اَنْ تُعْرَضَ عَلٰی نَبِیِّهِ الْعَمَلُ الْقَبِیْحُ .

تمہارے تمام اعمال ہر جمعرات کو عصر کے وقت رسولؐ اللہ کے پاس پیش ہوتے ہیں لہٰذا اس بات پر شرم کرو کہ تمہاری طرف سے کوئی برا عمل خدمت پیغمبرؐ میں پیش ہو۔ [1]

(iii) حضرت امام علی بن موسٰی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آپؑ کی خدمت عرض کیا میرے لیے اور میرے گھر والوں کے لیے دعا کیجیے۔

آپؑ نے فرمایا: تو کیا میں دعا نہیں کرتا **وَاللّٰهِ اِنَّ اَعْمَالَکُمْ لَتُعْرَضُ عَلٰی فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَّلَیْلَةٍ** خدا کی قسم تمہارے اعمال ہر روز و شب میرے سامنے پیش ہوتے ہیں راوی کہتا ہے کہ یہ بات مجھ پر گراں گزری۔ امام متوجہ ہوئے اور مجھ سے فرمایا: **اَمَّا تَقْرَءُ کِتَابَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ "وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون هُوَ وَاللّٰهِ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ "** کیا تو نے اللہ کی کتاب نہیں پڑھی جو کہتی ہے "عمل کرو خدا، اس کا رسولؐ اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں۔ خدا کی قسم مومنین سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السلام (اور ان کی اولاد میں سے دوسرے امامؑ) ہیں۔" [2]

تفسیر صافی میں بروایت کافی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کی وضاحت موجود ہے اور عیاشی سے بروایت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام منقول ہے کہ کوئی مومن یا کافر جہاں بھی مرے تو اس کے قبر میں داخل ہونے سے قبل اس کے جملہ اعمال حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اور یکے بعد دیگرے تمام آئمہ طاہرینؑ کے پیش کیے جاتے ہیں۔

[1] تفسیر برہان جلد 2 صفحہ 158 [2] اصول کافی جلد 1 صفحہ 171 باب عرض الاعمال

بہرحال اس مضمون کی روایات کتب شیعہ میں کثرت سے وارد ہیں کہ تمام اعمال آئمہ طاہرینؑ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ہمارے نیک اعمال کو دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں اور بداعمالیاں دیکھ کر وہ ناراض ہوتے ہیں۔ اس لیے تمام محبان محمد وآل محمد علیہم السلام کو چاہیے کہ اپنے اعمال کا ہر وقت جائزہ لیں کہ ان سے ایسے افعال سرزد نہ ہوں جن سے وہ ناراض ہوں اور ایسے اعمال بجالانے کی کوشش کریں جن سے وہ خوش ہوں۔

البتہ روایات کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایات میں صرف رسولؐ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ کچھ میں حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں اور بعض میں پیغمبر اکرمؐ اور تمام آئمہؑ کا ذکر ہے اسی طرح کچھ روایات صرف جمعرات کو عصر کے وقت اعمال پیش ہونے کے بارے میں ہیں۔ بعض میں ہر روز اعمال پیش ہونے کا تذکرہ ہے۔ کچھ ہفتہ میں دو مرتبہ۔ بعض میں ہر ماہ کے شروع میں اور بعض میں موت کے وقت اور قبر میں رکھے جانے کے وقت کا تذکرہ ہے۔

واضح ہے کہ یہ روایات آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ سب صحیح ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بہت سے اداروں میں ہر روز کی کارگردگی روزانہ، ہفتہ کی کارکردگی ہفتے کے آخر میں اور مہینے یا سال کی کارکردگی مہینے یا سال کے آخر میں اعلیٰ افسروں کو پیش کی جاتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خود زیرنظر آیت اور اس کی تفسیر میں وارد روایات سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے یا جیسا کہ اہل سنت کے مفسرین نے کہا ہے کہ آیت ایک عام مسئلے کی طرف اشارہ کررہی ہے وہ یہ کہ انسان جو بھی عمل کرتا ہے چاہے یا نہ چاہے ظاہر ہو ہی جاتا ہے اور خدا کے علاوہ پیغمبرؐ اور تمام مومنین

عام طریقوں ہی سے اس سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں خود آیت میں اس بارے میں کچھ شواہد موجود ہیں۔

پہلا یہ کہ آیت مطلق ہے اور اس میں تمام اعمال شامل ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تمام اعمال معمول کے طریقوں سے رسولؐ اللہ اور مومنین پر ظاہر نہیں ہوتے تھے کیونکہ بہت سے غلط اعمال مخفی طور پر انجام پاتے تھے اور اکثر اوقات پوشیدہ رہ جاتے تھے یہاں تک بہت سے اچھے اعمال بھی اسی طرح چھپے رہتے تھے۔

اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ تمام نیک اور بد اعمال میں سے اکثر سب پر واضح ہو جاتے تھے تو یہ ایک بے ہودہ بات ہوگی۔ لہٰذا لوگوں کے اعمال سے رسولؐ اللہ کی اور لوگوں کی آگاہی غیر معمولی طریقوں اور خدائی تعلیم ہی سے ہوسکتی ہے۔

دوسرا یہ کہ آیت کے آخر میں ہے: "فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْن" (خدا تمہیں قیامت میں اس سے آگاہ کرے گا جو تم عمل کرتے تھے) اس میں شک نہیں کہ اس جملے کے مفہوم میں انسان کے تمام اعمال شامل ہیں۔ چاہے وہ انہیں پوشیدہ طور پر بجالائے یا کھلم کھلا۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ آیت کی ابتدا اور آخر میں "عمل" کا ایک ہی مفہوم ہے لہٰذا آیت ابتدا میں ظاہر اور باطن میں کیے ہوئے تمام اعمال کے بارے میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان تمام سے آگاہی معمول کے طریقوں سے ممکن نہیں ہے۔ دوسروں لفظوں میں آیت کا آخری حصہ تمام اعمال کی جزا کے بارے میں ہے۔ اس لیے آغاز بھی خدا، رسولؐ اور مومنین کی تمام اعمال سے آگاہی سے متعلق ہے۔ ایک آگاہی کا مرحلہ ہے اور دوسرا جزا کا۔ بات دونوں میں ایک ہی موضوع سے متعلق ہے۔

تیسرا ارشاد خدا کے مطابق مؤمنین بھی ہمارے اعمال سے آگاہ ہوتے ہیں

لہذا ''مومنین'' کا ذکر اسی صورت میں صحیح ہے کہ مراد سب اعمال ہوں اور غیر معمولی طریقوں سے معلوم ہوں۔ ورنہ جو اعمال ظاہر اور واضح ہیں وہ تو مومنین اور غیر مومنین سب دیکھتے ہیں۔ پھر مؤمنین کی تخصیص کیسی۔

یہاں سے ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت سے مومنین سے مراد سب صاحب ایمان افراد نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ مخصوص افراد ہیں جو حکم خدا سے غیب کے رازوں سے آگاہ ہیں۔ یعنی رسولؐ اللہ کے حقیقی جانشین۔

ایک اہم نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اعمال کے پیش ہونے کا مسئلہ اس کے معتقدین کے لیے بہت زیادہ تربیتی اثر رکھتا ہے کیونکہ جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ خدا جو ہر جگہ ہمارے ساتھ موجود ہے اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ اور ہمارے محبوب پیشوا ہر روز یا ہر ہفتے ہمارے ہر عمل سے چاہے وہ اچھا ہو یا برا آگاہ ہو جاتے ہیں تو بلا شبہ ہم زیادہ احتیاط کریں گے اور اپنے اعمال کی طرف متوجہ رہیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ادارے میں کام کرنے والوں کو معلوم ہو کہ ہر روز یا ہر ہفتے ان کے تمام اعمال پوری تفصیل سے اعلیٰ افسروں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ ان سب سے باخبر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے کاموں کو بڑی توجہ سے سرانجام دیں گے۔

2. کیا رؤیت دیکھنے کے معنی میں ہے؟

بعض مفسرین میں مشہور ہے کہ " فسیری اللہ عملکم .... " میں رؤیت معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ علم کے معنی میں۔ کیونکہ اس کا ایک سے زیادہ مفعول نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر رؤیت علم کے معنی میں ہو تو اس کے لیے دو مفعول ہوں گے۔

اس میں کوئی حرج نہیں کہ رؤیت کو اس کے اصل معنی میں لیا جائے یعنی محسوسات کا مشاہدہ نہ کہ علم یا معرفت کے معنی میں۔ یہ بات خدا کے بارے میں جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور تمام محسوسات پر احاطہ رکھتا ہے قابل بحث نہیں لیکن پیغمبرؐ اور آئمہؑ کے متعلق بھی کوئی چیز مانع نہیں کہ وہ خود اعمال کو دیکھیں جب ان کے سامنے پیش ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسانی اعمال فانی نہیں ہیں بلکہ قیامت تک باقی رہیں گے۔

3. ''عنقریب خدا اعمال دیکھے گا'' سے کیا مراد ہے:

اس میں شک نہیں کہ خدا پہلے ہی ہمارے اعمال سے آگاہ ہے اور آیت میں '' فسیری الله ..'' یعنی خدا عنقریب تمھارے اعمال دیکھے گا'' سے مراد اعمال کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے وجود اور واقع ہونے کے بعد ہوگی۔

خلاصہ

1. اعمال پیش ہونے کا مسئلہ:

☆ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰؑ تمام امت کے اعمال سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

☆ بعض روایات میں صرف رسولؐ، کچھ میں حضرت علی علیہ السلام اور بعض میں پیغمبر اکرمؐ اور تمام آئمہؑ کا ذکر ہے اسی طرح کچھ روایات صرف جمعرات کو عصر کے وقت، بعض میں ہر روز اعمال پیش ہونے کا تذکرہ ہے۔ کچھ میں ہفتہ میں دو مرتبہ۔ بعض میں ہر ماہ کے شروع میں اور بعض میں موت کے وقت اور قبر میں رکھے جانے کے وقت کا تذکرہ ہے۔
واضح ہے کہ یہ روایات آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ سب صحیح ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بہت سے اداروں میں ہر روز کی کارگردگی روزانہ، ہفتہ کی کارکردگی ہفتے کے آخر میں اور مہینے یا سال کی کارکردگی مہینے یا سال کے آخر میں اعلیٰ افسروں کو پیش کی جاتی ہے۔

☆ اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ تمام نیک اور بد اعمال میں سے اکثر سب پر واضح ہو جاتے تھے تو یہ ایک بے ہودہ بات ہوگی۔ لہٰذا لوگوں کے اعمال سے رسولؐ اللہ کی اور مؤمنین کی آگاہی غیر معمولی طریقوں اور خدائی تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے۔

خود آیت میں اس بارے میں کچھ شواہد موجود ہیں۔

پہلا یہ کہ آیت مطلق ہے اور اس میں تمام اعمال شامل ہیں اور چاہے وہ مخفی بجا لائے گئے ہوں یا کھلم کھلا۔

دوسرا یہ کہ آیت کے آخر میں ہے: " فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ " (خدا تمہیں قیامت میں اس سے آگاہ کرے گا جو تم عمل کرتے تھے) آیت کا یہ آخری حصہ تمام اعمال کی جزا کے بارے میں ہے۔ اس لیے آغاز بھی خدا، رسولؐ اور مومنینؑ کی تمام اعمال سے آگاہی سے متعلق ہے۔ ایک آگاہی کا مرحلہ ہے اور دوسرا جزا کا۔ بات دونوں میں ایک ہی موضوع سے متعلق ہے۔

تیسرا یہ کہ "مومنین" کا ذکر اسی صورت میں صحیح ہے کہ مراد سب اعمال ہوں اور غیر معمولی طریقوں سے معلوم ہوں۔ ورنہ جو اعمال ظاہر اور واضح ہیں وہ تو مومنین اور غیر مومنین سب دیکھتے ہیں۔

☆ اس آیت سے مومنین سے مراد تمام مومنین نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ مخصوص افراد ہیں جو حکم خدا سے غیب کے رازوں سے آگاہ ہیں۔ یعنی رسولؐ کے حقیقی جانشین۔

☆ اعمال کے پیش ہونے کا مسئلہ معتقدین (پیروکاروں) کے لیے بہت زیادہ تربیتی اثر رکھتا ہے کیونکہ جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ خدا، پیغمبرؐ اور آئمہ ہدیٰ ہر روز یا ہر ہفتے ہمارے ہر عمل سے آگاہ ہو جاتے ہیں تو بلاشبہ ہم زیادہ احتیاط کریں گے۔

2. کیا رؤیت دیکھنے کے معنی میں ہے؟

اس میں کوئی حرج نہیں کہ رؤیت کو اس کے اصل معنی میں لیا جائے یعنی محسوسات کا مشاہدہ نہ کہ علم یا معرفت کے معنی میں۔ یہ بات خدا کے بارے میں جو ہر جگہ حاضر و ناظر

ہے اور تمام محسوسات پر احاطہ رکھتا ہے قابل بحث نہیں لیکن پیغمبرؐ اور آئمہؑ کے متعلق بھی کوئی چیز مانع نہیں کہ وہ خود اعمال کو دیکھیں جب ان کے سامنے پیش ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسانی اعمال فانی نہیں ہیں بلکہ قیامت تک باقی رہیں گے۔

3. ''عنقریب خدا اعمال دیکھے گا'' سے کیا مراد ہے:

اس میں شک نہیں کہ خدا پہلے ہی ہمارے اعمال سے آگاہ ہے۔ آیت میں اس جگہ اعمال کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے وجود اور واقع ہونے کے بعد ہوگی۔

خود آزمائی

1. پوشیدہ اور کھلم کھلا کیے ہوئے اعمال کو اللہ کے علاوہ کون کون دیکھتا ہے. آیت کا حوالہ بھی دیں۔
2. حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کی کہ آپؑ میرے اور میرے گھر والوں کے لیے دعا فرمائیں تو آپؑ نے کیا جواب دیا۔ کتاب کا حوالہ دیں۔
3. آیت رؤیت اعمال میں "مومنون" سے کون سی ہستی مراد ہے۔ کتاب کا حوالہ بھی دیں۔
4. جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کے تمام اعمال آئمہ طاہرینؑ کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟
5. رؤیت اعمال کی روایات میں اختلاف ہے۔ کیا یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں؟
6. کیا آیت ایک عام مسئلے کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ انسان جو بھی عمل کرتا ہے وہ چاہے یا نہ چاہے خدا کے علاوہ پیغمبرؐ اور تمام مومنین عام طریقوں ہی سے ان سے آگاہ ہو جاتے ہیں؟
7. آیت رؤیت اعمال کا آخری جملہ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ اعمال کی آگاہی کے متعلق ہے یا جزا کے بارے میں؟
8. کیا رؤیت دیکھنے کے معنی میں ہے؟
9. خدا تو پہلے ہی ہر شخص کے اعمال کو جانتا ہے پھر یہ جملہ "عنقریب خدا اعمال دیکھے گا" سے کیا مراد ہے؟

14

آیت مِنْ شِیْعَتِہٖ

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ o

ترجمہ: اور یقیناً ان ہی کے طریقہ پر چلنے والوں میں ابراہیمؑ بھی ضرور تھے۔ (سورۃ الصّٰفّٰت 37 آیت 83 پارہ 23)

تفسیر

قرآن کی اس واضح آیت ”کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے شیعہ تھے“ کے باوجود بھی شیعہ کے خلاف ہر دور میں پروپیگنڈا کی انتہا کر دی گئی۔ طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں حتیٰ کہ حق اور سچ کی آواز کو دبانے کے لیے حکومتوں کا بھی بے دریغ استعمال کیا جاتا رہا۔ یہ کوشش کی جاتی رہی کہ شیعہ مذہب کو اس قدر بدنام کر دیا جائے کہ نئی نسل اس کے متعلق کچھ بھی غور کرنا گوارا نہ کرے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ایک یہودی نامی شخص عبداللہ بن سبا اس کا بانی ہے۔ شیعہ فرقے کی بنیاد عالم اسلام کے خلاف کسی سازش کا نتیجہ تھی وغیرہ وغیرہ خدا اور رسولؐ کے ایجنڈے کے علاوہ غیروں کے ایجنڈے کو پروان چڑھانے والوں نے اس پروپیگنڈے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مذہب شیعہ کے مقابلے میں نئے نئے ناموں سے فرقے اور مذاہب متعارف کروائے گئے۔

حالانکہ سورۃ النحل 16 آیت 123 میں حضورؐ کو حکم دیا گیا ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اِنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا (اے رسولؐ) پھر ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا: وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ اور یقیناً ابراہیمؑ

بھی نوحؑ کے شیعہ یعنی انہی کے طریقہ پر چلنے والوں میں سے تھے۔[1] اگر اللہ کے نزدیک لفظ شیعہ قابل مذمت ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ قرار نہ دیا جاتا۔

اہل سنت والجماعت مفسرین کی نظر میں:

قرآن مجید کی اس واضح نص کے باوجود بھی بعض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ میں "ھُوَ" کی ضمیر کا مرجع آذر ہے لہذا ترجمہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ آذر کے گروہ میں سے تھے۔

ہم معتبر اہل سنت والجماعت مفسرین کی روشنی میں نقل کرتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں عالم اسلام کے علماء کا اتفاق ہے کہ اس آیت وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ سے مراد حضرت ابراہیمؑ کا آذر کے گروہ سے ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ حضرت نوحؑ کے گروہ یعنی ان کے طریقہ پر چلنے والے ہونا ثابت ہے۔

1. تفسیر جلالین صفحہ 376 میں ہے: وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ اَیْ مِمَّنْ تَابَعَہٗ فِیْ اَصْلِ الدِّیْنِ لَاِ بْرَاھِیْمَ اِنْ طَالَ الزَّمَانُ بَیْنَھُمَا وَھُوَ اَلْفَانِ وَسِتُّمِائَۃٍ وَّاَرْبَعُوْنَ سِنَۃً وَکَانَ بَیْنَھُمَا ھُوْدٌ وَصَالِحٌ اور تحقیق اس کے شیعہ میں سے یعنی حضرت ابراہیمؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حضرت نوحؑ کی اصل دین میں تابعداری کی۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان لمبا عرصہ گزر چکا تھا۔ یعنی دو ہزار چھ سو چالیس سال گزر چکے تھے۔

2. تفسیر بیضاوی صفحہ 132 جلد دوم علی حاشیہ القران مطبوعہ مصر میں ہے: وَاِنَّ

[1] یہ واضح رہے کہ نبی ہونا اس کے منافی نہیں کہ دوسرے کا اتباع کیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی جگہ پر مستقل نبی بھی تھے اور حضرت نوحؑ کے شیعہ بھی تھے۔

مِنْ شِیْعَتِہٖ مِمَّنْ شَایَعَهٗ فِی الْاِیْمَانِ وَاَصُوْلِ الشَّرِیْعَةِ کہ حضرت ابراہیمؑ ایمان اوراصول شریعت میں حضرت نوحؑ کے تابعدار تھے۔

3. حاشیہ بیضاوی صفحہ 157 میں ہے: مِمَّنْ شَایَعَهٗ فِی الشَّرِیْعَةِ اَصُوْلِهَا وَفُرُوْعِهَا...... وَشِیْعَةُ الرَّجُلِ اِتِّبَاعَهٗ وَانصاره مَنْ شَایَعَهٗ شِیَاعًا اِلٰی تبعِہٖ . کہ حضرت ابراہیمؑ ان لوگوں سے جو حضرت نوحؑ کی شریعت، اصول اور فروع میں تابعدار تھے اور شیعہ کے معنی تابعدار اور مددگار کے ہیں۔

4. تفسیر فتح القدیر مصنفہ علامہ شوکانی جلد چہارم صفحہ 389 میں ہے: ثُمَّ سُبْحَانَهٗ قِصَّةَ اِبْرَاهِیْمَ وَبَیَّنَ اِنَّهٗ مِمَّنْ شَایَعَ نُوْحًا فَقَالَ وَ ان مِنْ شِیْعَته لَاِ بْرَاهِیْمَ اَیْ مِنْ اَهْلِ دِیْنِهٖ وَمِمَّنْ شَایَعَهٗ وَوَاقَفَهٗ عَلَی الدُّعَاءِ اِلَی اللّٰهِ وَاِلٰی تَوْحِیْدِهٖ وَالْاِیْمَانِ بِهٖ پھر اللہ تعالیٰ نے قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ذکر فرمایا اور بیان کیا کہ حضرت ابراہیمؑ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حضرت نوحؑ کی پیروی اور موافقت کی۔ اللہ اور اس کی توحید کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔

آیت کی تاؔویل:

تفسیر برہان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کی تاویل میں اِنَّ مِنْ شِیْعَةِ عَلِیٍّ منقول ہے اور اس تاویل کی تائید میں یہ روایت نقل کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے سامنے سے پردے اٹھائے گئے اور ملکوت سماویہ کی ان کو سیر کرائی گئی تو انہوں نے عرش کے پہلو میں ایک چمکتا ہوا نور دیکھا تو

دریافت کیا اے پروردگار یہ نور کس کا ہے؟ تو جواب ملا۔ یہ نورِ محمدؐ ہے جو میری تمام مخلوق سے برگزیدہ ہے۔ پھر اس کے پہلو میں دوسرا نور دیکھا تو پوچھا یہ کون ہے؟ تو جواب ملا یہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کا نور ہے جو میرے دین کا ناصر ہے۔ پھر ان کے پہلو میں تین چمکتے ہوئے انوار دیکھے اوران کے متعلق دریافت کیا تو ارشاد پروردگار رہوا کہ ایک نور فاطمہؑ ہے جو اپنے شیعوں کو آتش جہنم سے آزاد کرائیں گی اوردواس کے فرزندوں یعنی حسنؑ وحسینؑ کے نور ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی۔ اے پروردگارا ان پانچ انوار کے اردگرد مجھے نو انوار نظر آرہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ تو علی بن الحسینؑ سے لے کر حضرت حجۃ العصرؑ تک آئمہؑ کا تعارف کرایا گیا کہ یہ علیؑ وفاطمہؑ کی اولاد سے ہوں گئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی۔ اے پروردگار اِن چودہ کے اردگرد بے حساب انوار موجود ہیں وہ کون ہیں؟ تو ارشاد ہوا۔ وہ انکے شیعوں کے نور ہیں۔ پس انہوں نے عرض کی کہ ان کی نشانیاں کیا ہوں گی تو جواب ملا۔ ان کی یہ نشانیاں ہوں گی:

(i) 51 رکعت یومیہ نماز (17 فرائض اور 34 نوافل)

(ii) بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا۔

(iii) رکوع سے پہلے قنوت پڑھنا۔

(iv) دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا۔

(v) بعض روایات میں زیارت اربعین کا پڑھنا مذکور ہے۔

اُس وقت حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی۔ اے اللہ: **اِنَّ مِنْ شِیْعَةِ عَلِیٍّ** بے شک مجھے حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے شیعوں میں سے قرار دے۔

چند اہم نکات:

لفظ شیعہ قرآن کی نظر میں:

قرآن میں شیعہ سے مراد جماعت، گروہ، فرقہ، تابعدار، طریقہ پر چلنے والے، امّت اور قوم لیا گیا ہے۔ گزشتہ انبیاء کی امتیں شیعہ کہلاتی تھیں۔ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ قرار دیا۔ قرآن میں 11 مقامات میں لفظ شیعہ استعمال ہوا ہے:

(i) ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّاo

ترجمہ: پھر ہر امّت میں سے ہم ایسے لوگوں کو کھینچ نکالیں گے جو خدا سے سخت سرکشی کرتے تھے۔ (سورہ مریم 19 آیت 69)

اس آیت سے معلوم ہوا ہر گزشتہ نبی کی امت کا نام شیعہ تھا۔ اسی لیے تمام امتوں کے گنہگار روزِ قیامت الگ کیے جائیں گے۔

علامہ ابن اثیر نے جلد 3 صفحہ 131 پر مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ کی تفسیر بقول حضرت مجاہد مِنْ كُلِّ اُمَّتٍ فرمائی ہے اور بقول حضرت قتادہ مِنْ كُلِّ اَهْلِ دِيْنٍ یعنی تمام اہل ادیان سے گنہگار جدا کئے جائیں گے۔ جب تمام امتوں کو خدا نے شیعہ کہا ہے پھر ہم اپنے آپ کو شیعہ کہلوانے میں کیوں نہیں فخر کرتے۔

(ii) اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَo

ترجمہ: بے شک فرعون نے (مصر کی) سرزمین میں بہت سر اٹھایا تھا اور اس نے وہاں کے رہنے والوں کو کئی گروہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو عاجز کر رکھا تھا

کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا تھا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بے شک وہ بھی مفسدوں میں تھا۔ (سورۃ القصص 28 آیت 4)

(iii) قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْيَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ o

ترجمہ: (اے رسولؐ) کہہ دیجیے۔ کہ وہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ (مختلف گروہ) کر دے اور ایک کو دوسرے (سے لڑا کر آپس) کی لڑائی کا مزا چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تا کہ یہ لوگ سمجھیں۔ (سورۃ انعام 6 آیت 65)

(iv) اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ط اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ o

ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے دین میں (بہت سے) رستے نکالے اور کئی کئی فرقے (گروہ) ہو گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔ ان کا کام خدا کے حوالے۔ پھر جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں وہ اُن کو (سب) بتائے گا۔ (سورۃ الانعام 6 آیت 159)

(v) مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ط كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ o (سورۃ الروم 30 آیت 32)

ترجمہ: (اور نہ) ان لوگوں میں (ہونا) جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور (خود) فرقے فرقے ہو گئے۔ سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔

(vi) وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ o (سورۃ القمر 54 آیت 51)

ترجمہ: اور ہم تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے۔

(vii) وَحِیْلَ بَیْنَھُمْ وَ بَیْنَ مَا یَشْتَھُوْنَ کَمَا فُعِلَ بِاَشْیَاعِھِمْ مِّنْ قَبْلُ ط اِنَّھُمْ کَانُوْا فِیْ شَکٍّ مُّرِیْبٍo (سورۃ سبا 34 آیت 54)

ترجمہ: اور ان میں اور ان کی خواہش کی چیزوں میں پردہ حائل کر دیا گیا جیسے ان کے پہلے گروہوں سے کیا گیا تھا۔ وہ بھی الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے ہوئے تھے۔

(viii) وَدَخَلَ الْمَدِیْنَۃَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَۃٍ مِّنْ اَھْلِھَا فَوَجَدَ فِیْھَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ز ھٰذَا مِنْ شِیْعَتِہٖ وَھٰذَا مِنْ عَدُوِّہٖ ج فَاسْتَغَاثَہُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِہٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّہٖ لا فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْہِ ز قَالَ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ط اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌo (سورۃ القصص 28 آیت 15)

ترجمہ: اور ایک دن اتفاقاً موسیٰؑ شہر میں ایسے وقت آئے کے وہاں کے لوگ (نیند کی) غفلت میں پڑے ہوئے تھے تو دیکھا کہ وہاں دو آدمی آپس میں لڑے مرتے ہیں (ایک) تو ان کی قوم (بنی اسرائیل) کا ہے اور وہ (دوسرا) ان کے دشمن کی قوم (قبطی) کا ہے تو جو شخص ان کی قوم کا تھا اس نے اس شخص پر جو ان کے دشمنوں میں تھا (غلبہ حاصل کرنے کے لیے) موسیٰؑ سے مدد مانگی۔ یہ سنتے ہی موسیٰؑ نے ایک ہی گھونسا مارا تھا کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔ موسیٰؑ نے (اس وقت) کہا کہ یہ (ان کا لڑنا جھگڑنا) شیطانی کام تھا اس میں شک نہیں کہ وہ دشمن اور کھلم کھلا گمراہ کرنے والا ہے۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے امتی کو شیعہ کہہ کر بیان کیا گیا۔

یہاں بغیر کسی تاویل کے شیعہ کا معنی محبّ اور عدو کا معنی دشمن ہے۔

(ix) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ شِیَعِ الْاَ وَّلِیْنَo

ترجمہ: اور (اے رسولؐ) ہم نے تم سے پہلے بھی اگلی امتوں میں (اور بھی بہت سے) رسول بھیجے۔ (سورۃ الحجر15 آیت10)

(x) وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ o (سورۃ الصافات37 آیت83)

ترجمہ: اور یقیناً ان ہی کے طریقہ پر چلنے والوں میں ابراہیمؑ بھی ضرور تھے۔

لفظ ''شیعہ'' کا لغوی واصطلاحی معنی:

1. عربی کی لغت ''المنجد'' میں ہے:

شِیْعَۃ : (الرجل) آدمی کے پیروکار اور مددگار۔

الشیعۃ : فرقہ (واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے یکساں ہے) حضرت علیؑ کے طرفدار۔

2. مشہور لغت ''قاموس'' میں شیعہ کے معنی گروہ، پیروکار، محبّ، مددگار کے ہیں۔

شِیْعَۃُ الرَّجُلِ (بِالْکَسْرِ) اِتْبَاعُہٗ وَاَنْصَارُہٗ شیعہ کسی شخص کے پیروکار اور مددگار کو کہتے ہیں۔ وَقَدْ غَلَبَ ھٰذَاالْاِسْمُ عَلٰی کُلِ مَّنْ یَّتَوَلّٰی عَلِیًّا وَ اَھْلَ بَیْتِہٖ حَتّٰی صَارَ لَھُمْ اِسْمٌ خَا صًّا ''یہ نام (شیعہ) غالب آگیا ہے ہر اس آدمی پر جو حضرت علیؑ اور ان کے اہل بیتؑ سے محبت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔''

3. لغت ''مفردات القرآن'' میں علامہ راغب اصفہانی لفظ شیعہ کے حسب ذیل معنی لکھتے ہیں: الشیعۃ وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے اور وہ اس کے اردگرد پھیلے رہتے ہیں۔ (شیعہ کی جمع ''شیع'' و ''اشیاع'' آتی ہے)

4. ''لغات الحدیث''میں مولانا وحید الزمان لفظ شیعہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔شیعہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو شخص کسی کی مدد کرے اور اسکی جماعت میں شریک ہو جائے وہ اس کا شیعہ کہلائے گا۔اصل میں شیعہ گروہ کو کہتے ہیں اب اس کا استعمال ان کے لئے کیا جاتا ہے جو حضرت علیؑ اور آپؑ کے اہل بیتؑ سے محبت رکھتے ہیں۔

5. ''النھایہ لابن اثیر'' کی عبارت ملاحظہ ہو: اَلشِّیْعَۃُ قَدْ غَلَبَ ھٰذَاالْاِسْمُ علیٰ کُلِّ مَنْ یَدَّعِمُ اِنَّہٗ یَتَوَ لّٰی عَلِیًّاوَاَھْلَ بَیْتِہٖ حَتّٰی صَارَلَھُمْ اِسْمًا خَا صًّا پھر شیعہ لفظ کے غالب معنی یہ ہو گئے کہ وہ شخص جو حضرت علیؑ اور ان کے اہل بیتؑ کو دوست رکھے یہاں تک کہ ان لوگوں کا نام شیعہ ہو گیا۔

6. مقدمہ فتح الباری صفحہ 179 جلد 2 میں ہے: اَلتَّشَیُّـــعُ مُـحَبَّۃِ عَـلِـیّ وَ تَـقْـدِیْـمُـہٗ عَلٰی اَصْحَابِہٖ فَمَنْ قَدَّمَہٗ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ فَھُوَ غَالٍ فِیْ شِیْعَتِہٖ کہ مذہب شیعہ حضرت علیؑ کی محبت اور صحابہ کرامؓ پر ان کو مقدم کرنے کا نام ہے۔پس جس شخص نے ابوبکرؓ اور عمرؓ پر بھی ان کو مقدم کیا وہ غالی شیعہ ہے۔

7. علامہ طبرسی نے تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ شیعہ اس جماعت کا نام ہے جو کسی رئیس و سردار کے تابع ہو۔لیکن عرف اسلام میں اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام کے وہ پیروکار ہیں جو آپؑ کے دشمنوں کے خلاف لڑتے رہے اور ان کے بعد ان کی اولاد طاہرین علیہم السلام کے ساتھ رہے اور ابوبصیر نے حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے۔آپؑ نے فرمایا۔تمہیں یہ نام مبارک ہو۔راوی کہتا ہے میں نے عرض کی حضور وہ کونسا نام؟ تو آپؑ نے فرمایا کہ شیعہ۔میں نے عرض کی کہ لوگ تو ہمیں اس نام کا طعنہ دیتے ہیں آپؑ نے فرمایا تم نے خداوند کریم کا یہ فرمان نہیں پڑھا وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرَاھِیْمَ۔

محبّانِ علیؑ کے لیے لفظ شیعہ کے موجد اور بانی خود رسولؐ اللہ ہیں:

لفظ شیعہ کی اصطلاح حضورؐ کے زمانے میں حضرت رسالت مآبؐ نے خود حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے استعمال کی۔ لہٰذا محبان حضرت علیؑ کے لیے اس لفظ کے موجد اور بانی خود پیغمبر اکرمؐ ہیں۔ یہ کلمہ اس زبان اقدس سے جاری ہوا جو وحی الٰہی کے بغیر کلام بھی نہیں کرتی وَمَایَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیO اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰO[1] حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں کو نجات یافتہ اور جنتی فرمایا ہے۔

تفاسیر واحادیث کی اکثر کتب میں یہ روایت موجود ہے:

عَنْ جَابِرٍؓ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ کُنَّا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَاَقْبَلَ عَلِیٌّ فَقَالَ النَّبِیُّ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّ ھٰذَا وَ شِیْعَتَہٗ لَھُمُ الْفَائِزُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے۔ کہ تحقیق ہم حضورؐ کے پاس بیٹھے تھے پس حضرت علی علیہ السلام آئے پس نبی کریمؐ نے فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تحقیق یہ علیؑ اور اس کے شیعہ روز قیامت ضرور کامیاب اور نجات پانے والے ہوں گے۔[2]

واضح رہے کہ عالم اسلام کے مخالفین نے شیعہ کو بدنام کرنے کے لیے عبداللہ بن سباء نامی یہودی کا کردار متعارف کروایا۔ علماء امامیہ اور شیعان حیدر کرار اسے لعنتی اور ملعون سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید، تفاسیر، احادیث اور تواریخ کی روشنی میں وہ تو اتنا جانتے ہیں کہ

[1] ترجمہ: اور وہ تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بولتے ہی نہیں۔ یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔ (سورۃ النجم 53 آیت 3,4)

[2] تفسیر فتح القدیر جلد 2 صفحہ 464، تفسیر در منثور جلد 6 صفحہ 379، تفسیر ابن جریر جلد 3، صواعق محرقہ صفحہ 96

محبان حیدر کرارؑ کے لیے شیعہ لفظ کی موجد اور بانی خود حضورؐ کی ذات گرامی ہے۔

پیغمبرؐ کے زمانہ میں آنحضرتؐ کے خاص خاص صحابہؓ کو شیعہ کہا جاتا تھا جیسا کہ حافظ ابوحاتم رازی کتاب ''الزینۃ'' میں جو انہوں نے صاحبان علوم کے درمیان مروجہ الفاظ کی تشریح میں لکھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ پہلا نام جو زمانہ رسولؐ خدا میں اسلام کے اندر وجود میں آیا وہ شیعہ تھا اور صحابہؓ میں سے چار افراد اس لقب کے حامل تھے۔ ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، مقدادؓ اور عمار یاسرؓ۔

کیا اہل سنت والجماعت ابتدائے اسلام میں شیعہ کہلاتے تھے؟

تحفہ اثناء عشریہ صفحہ 28 میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:

اوّل کسیکہ بشیعہ ملقب شدند جماعت از مہاجرین و انصار و تابعین ایشانند کہ مشایعت و متابعت حضرت مرتضیٰ نمودند در وقتیکہ جناب ایشان خلیفہ شدند و ملازمت و صحبت اختیار نمودند و محاربین ایشان جنگ نمودند و مطیع امرو نواھی ایشان ماندند ایشان را شیعہ مخلص گوئیند و ابتدائے ایں لقب در 37 ہ بود از ھجرت.

کہ پہلے جو لوگ لقب شیعہ سے مشہور اور منسوب ہوئے وہ صحابہ کرام تھے مہاجرین اور انصار اور تابعین کی وہ جماعت جنہوں نے معاویہ کے مقابلے میں حضرت علیؑ کی تابعداری اور پیروی کی۔ جب جناب ان کے خلیفہ ہوئے اور ان کی صحبت اختیار کی اور ان کے دشمنوں سے جنگ کی اور ان کے امر و نہی کے مطیع ثابت ہوئے ان کو شیعہ مخلصین کہتے ہیں۔ اس لقب کی ابتداء 37 ہجری میں ہوئی۔

مزید لکھتے ہیں: ''یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ شیعان اولیٰ جس میں اہل سنت اور اہل

تفضیل دونوں شامل ہیں۔ پہلے شیعہ ہی کہے جاتے تھے۔مگر جب سے غلاۃ (غالی) روافض،زیدیوں،اوراسمٰعیلیوں نے اپنے لئے شیعہ لقب اختیار کیا اوران کے اعمال و عقائد کی قباحتیں اورشر ظاہر ہونے لگے تو حق و باطل کے مل جانے کے خطرہ کے پیش نظر فرقہ سُنیہ وتفضیلیہ نے اس لقب کو اپنے لئے ناپسند کر کے ترک کردیا اوراس کی جگہ اہل سنت والجماعت کا لقب اختیار کیا۔اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ تاریخ کی قدیم کتابوں میں اساتین اہل سنت کے لیے جو یہ الفاظ "فلاں من الشیعة او من شیعة" مذکور ہیں۔تو یہ الفاظ اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ پہلے ایسے حضرات کا لقب شیعان اولیٰ تھا۔واقدی کی تاریخ اوراستیعاب میں اس قسم کے الفاظ بہت آتے ہیں لہذا اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ یہ حضرات مذکورین ہرگز ایسے شیعہ نہ تھے۔بلکہ حضرت علیؑ کی رفاقت اور مددگاری کے سبب شیعانِ علیؑ کہلاتے تھے۔" (تحفہ اثناعشریہ اردو صفحہ 40)

شرح مواقف صفحہ 752 اہل سنت کے علم کلام اورعقائد کی معتبر کتاب "اَلْفِرْقَةُ الثَّانِيَةُ مِنْ كِبَارِ الْفِرَقِ الْاِسْلَامِيَّةِ الشِّيْعَةُ هُمُ الَّذِيْنَ شَايَعُوْا عَلِيًّا قَالُوْا اَنَّهُ الْاِمَامُ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ بِالنَّصِّ اِمَّا جَلِيًّا وَ اِمَّا خَفِيًّا وَاعْتَقَدُوْا اِنَّ الْاِمَامَةَ لَا يَخْرُجُ عَنْهُ وَ عَنْ اَوْلَادِهٖ وَ اِنْ خَرَجَتْ فَاِمَّا بِظُلْمٍ يَكُوْنُ مِنْ غَيْرِهِمْ".

اسلام کے بڑے فرقوں میں سے بڑا فرقہ شیعہ ہے اور شیعہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت علیؑ کی پیروی کی اوراس بات کے قائل ہیں کہ حضرت علیؑ رسولؐ اللہ کے بعد نص کے ساتھ خواہ وہ نص جلی ہو یا خفی ہو حق کے امام ہیں اور شیعہ کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ امامت حضرت علیؑ اوران کی اولاد سے باہر نہیں جاسکتی۔اگر کبھی امامت باہر گئی تو یا ظلم سے گئی یا اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے۔

کون سا فرقہ روز قیامت نجات یافتہ ہوگا؟

قرآن مجید، تفاسیر، احادیث اور تواریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روز قیامت صرف شیعان حیدر کرار ہی نجات یافتہ اور جنتی ہوں گے۔ اہل سنت والجماعت کے معتبر مفسرین، محدثین اور مورخین نے اپنی کتب میں اس کی وضاحت کی ہے:

سورۃ البینہ 98 آیت 7,8 : اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ[1] نازل ہوئیں تو رسول اللہ نے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے خطاب کیا اور فرمایا کہ یَا عَلِیُّ هُوَ اَنْتَ وَشِيْعَتُكَ تَاتِيْ اَنْتَ وَشِيْعَتُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَاضِيْنَ مَرْضِيِّيْنَ یعنی یا علی آیت مبارکہ میں خیر البریہ سے تم اور تمہارے شیعہ مراد ہیں روز قیامت تم اور تمہارے شیعہ اس حالت میں آؤ گے کہ خدا تم سے راضی ہوگا اور تم بھی خدا سے راضی وخوش ہوگے۔

ابوالمؤید موفق بن احمد خوارزمی نے مناقب کی سترھویں فصل میں، حاکم ابوالقاسم عبیداللہ الحسکانی نے کتاب شواہد التنزیل فی قواعد التفصیل میں، محمد بن یوسف گنجی شافعی نے کفایت المطالب کے صفحہ 119 میں، سبط ابن جوزی نے تذکرۂ خواص الامہ فی معرفۃ الائمہ کے صفحہ 31 میں اور منذر بن محمد منذر نے اور خاص طور پر حاکم نے روایت کی ہے کہ حاکم ابوعبداللہ حافظ نے ہم کو خبر دی ایسے اسناد کے ساتھ جو مرفوع ہیں یزید بن شراحیل انصاری کاتب حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی طرف کہ انہوں نے کہا میں نے ان

[1] بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہی تمام مخلوق میں بہتر ہیں ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔

حضرات سے سنا کہ آپؑ نے فرمایا حضرت خاتم الانبیاءؐ کی رحلت کے وقت آنحضرتؐ کی پشت مبارک میرے سینے پر تھی اس وقت آپؐ نے فرمایا: یَاعَلِیُّ اَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ اللّٰہِ تَعَالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ......الخ ھم شیعتک وموعدی وموعدکم الحوض اذا اجتمعت الامم للحساب تدعون غراً محجلین یعنی یا علیؑ کیا تم نے یہ آیت شریفہ نہیں سنی ہے؟ صاحبان ایمان واعمال صالحہ اور خیر البریہ وہ تمہارے شیعہ ہیں اور میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوض کوثر کے کنارے ہوگی۔ جس وقت کل مخلوق حساب کے لیے جمع ہوگی تو تم غر محجلین کہہ کے پکارے جاؤ گے یعنی روشن اور سفید چہرے والو۔

جلال الدین سیوطی جو اہل سنت کے مایہء ناز علماء میں سے ہیں اور نویں صدی ہجری میں اُن کو طریقہء سنت والجماعت کا مجدد مانا گیا ہے (جیسا کہ صاحب فتح المقال نے لکھا ہے) اپنی تفسیر درالمنثور فی کتاب اللہ بالماثور' میں ابوالقاسم علی بن الحسن معروف بہ ابن عساکر دمشقی سے جو فضلائے زمانہ میں سے ہیں اور خاص علماء کے محل وثوق ہیں (جیسا کہ ابن خلکان نے دفیات الاعیان میں) ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں، خوارزمی نے رجال مسند ابی حنیفہ اور طبقات شافعیہ میں اور حافظ ابوسعید نے اپنی تاریخ میں اُن کی تعریف و توثیق کی ہے کہ ابن عساکر فخر شافعیہ اور اپنے زمانہ میں امام اہل حدیث تھے۔ کثیر العلم، عزیز الفضل، ثقہ، صاحب تقویٰ اور 550ء میں علماء اہل سنت والجماعت کے درمیان مشہور تھے) بروایت جابر بن عبداللہ انصاریؓ جو حضرت رسولؐ خدا کے کبار صحابہؓ میں سے تھے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں خدمت رسولؐ میں حاضر تھا کہ اتنے میں علی بن ابی طالبؑ تشریف لائے پیغمبرؐ نے فرمایا۔ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّ ھٰذَا وَشِیْعَتَہٗ لَھُمُ الْفَائِزُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَنَزَلَ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ

خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ۔ یعنی قسم اُس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ مرد (اشارہ علیؑ کی طرف) اور اُس کے شیعہ قیامت کے روز نجات یافتہ ہیں اس وقت آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اسی تفسیر میں ابن عدی سے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ اُنھوں نے کہا میں خدمت رسولؐ میں تھا کہ آیت مذکورہ نازل ہوئی، رسولؐ اللہ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: تَاتِیْ اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ رَاضِیْنَ مَرْضِیْنَ. یعنی تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے روز اس صورت سے آئیں گے کہ خدا سے راضی ہوں گے اور خدا تم لوگوں سے راضی ہوگا۔

مناقب خوارزمی فصل نہم میں بسند جابر بن عبداللہ انصاریؓ نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں رسولؐ اللہ کی خدمت میں تھا۔ حضرت علیؑ ہم لوگوں کے پاس آئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا۔ قَدْ اَتَاکُمْ اَخِیْ یعنی میرا بھائی (علیؑ) تمہاری طرف آیا ہے۔ اس کے بعد کعبہ کی طرف رُخ کیا اور علیؑ کا ہاتھ پکڑ کے فرمایا۔ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّ ھٰذَا وَشِیْعَتَہٗ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یعنی قسم اس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ علیؑ اور اس کے شیعہ قیامت کے روز نجات یافتہ ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ علیؑ تم سب سے پہلے ایمان لائے، عہد خدا میں تم سب سے زیادہ باوفا ہیں، رعایا کے درمیان تم سب سے زیادہ انصاف کرنے والے اور تم سب سے زیادہ عادلانہ تقسیم کرنے والے ہیں اور پروردگار کے نزدیک تم سب سے زیادہ اُن کا مرتبہ بلند ہے اُسی وقت مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد علیؑ کسی مجمع کے اندر آتے تھے تو اصحاب پیغمبر کہتے تھے جَاءَ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ یعنی تمام لوگوں سے بہتر انسان آگیا۔

نیز ابن حجر نے صواعق میں اور ابن اثیر نے نہایہ جلد 3 میں اس آیۂ شریفہ کی شان نزول میں یہی روایت نقل کی ہے۔

اس کے علاوہ ابن حجر نے صواعق کے باب 11 میں حافظ جمال الدین محمد بن یوسف زرندی مدنی سے نقل کیا ہے کہ جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے علیؑ سے فرمایا: یَاعَلِیُّ اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ تَاتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَنْت وَشِیْعَتُکَ رَاضِیْنَ مَرْضِیْنَ وَیَاتِیْ عَدُوُّکَ غَضْبَانًا مُقْمَحِیْنَ فَقَالَ مَنْ عَدُوِّیْ قَالَ مَنْ تَبَرَّمِنْکَ وَلَعَنَکَ یعنی یا علیؑ تم اور تمہارے شیعہ کل مخلوقات سے بہتر ہیں تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے روز اس حالت سے آئیں گے کہ خدا بھی تم سب سے راضی ہوگا تمہارے دشمن غصے میں بھرے ہوئے آئیں گے اور ان کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوں گے۔ پھر امیر المومنینؑ نے عرض کیا کہ میرا دشمن کون ہے؟ فرمایا جو شخص تم سے بیزاری اختیار کرے اور تمہیں برا بھلا کہے۔

علامہ سمہودی جواہر العقدین میں حافظ جمال الدین رزندی مدنی اور نور الدین علی بن محمد بن احمد مالکی مکی مشہور بہ ابن صباغ سے جو آپ کے اکابر علماء اور فحول فقہا میں ہیں فصول المہمہ صفحہ 122 میں ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آیت مذکورہ نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے علیؑ سے فرمایا: ھُوَاَنْتَ وَشِیْعَتُکَ تَاتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَنْتَ وَھُمْ رَاضِیْنَ مَرْضِیْنَ یَاتِیْ عَدُوُّکَ غَضْبَانًا مُقْمَحِیْنَ یعنی وہ بہترین مردم تم اور تمہارے شیعہ ہیں تم اور وہ لوگ روز قیامت اس طرح آئیں گے کہ خدا سے راضی ہوں گے اور خدا اُن سے راضی ہوگا اور تمہارے دشمن اس صورت سے آئیں گے کہ غم وغصہ سے بھرے ہوئے اور اُن کے ہاتھ ان کی گردنوں سے بندھے ہوں گے۔

سید علی ہمدانی شافعی کتاب مودۃ القربیٰ میں اور ابن حجر صواعق محرقہ میں رسولؐ اللہ کی زوجہ محترمہ اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: یَاعَلِیُّ اَنْتَ وَاَصْحَابُکَ فِی الْجَنَّۃِ اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ فِی الْجَنَّۃِ یعنی یا علیؑ تم اور

تمہارے اصحاب جنت میں رہیں گے۔ تم اور تمہارے شیعہ جنت میں رہیں گے۔

اہل حدیث کی معتبر تفسیر فتح البیان مصنفہ نواب صدیق حسن بوپالی صفحہ 333 جلد دہم مطبوعہ مصر میں ہے:۔

عَنۡ جَابِرِ بۡنِ عَبۡدِاللّٰہِ قَالَ کُنَّا عِنۡدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فَاَقۡبَلَ عَلِیٌّ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ (وَاٰلِہٖ) وَسَلَّمَ وَالَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِہٖ اِنَّ ھٰذَا وَشِیۡعَتَہٗ لَھُمُ الۡفَائِزُوۡنَ یَوۡمَ الۡقِیَامَۃِ وَنَزَلَتۡ اِنَّ الَّذِیۡنَ آمَنُوۡاالآیۃ فَکَانَ مُحَمَّدٌصَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ (وَاٰلِہٖ) وَسَلَّمَ اِذۡا قۡبَلَ قَالُوۡا قَدۡ جَاءَ خَیۡرُالۡبَرِیَّۃِ.

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ہم رسولؐ اللہ کے پاس بیٹھے تھے کہ حضرت علیؑ تشریف لائے۔ حضورؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ تحقیق یہ علیؑ اور اس کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰئِکَ ھُمُ الۡخَیۡرُالۡبَرِیَّۃِ اس دن سے جب بھی حضرت علیؑ آتے تو صحابہ کرامؓ ان کو خیر البریہ کے لقب سے یاد کرتے تھے کہ خیر البریہ[1] آیا۔ اس حدیث سے حضرت علیؑ کی افضلیت اور شیعہ کی فضلیت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ قرآن کا مذہب رسولؐ اللہ کے فرمان کا مذہب ہے۔

شیعہ اور محبّ میں فرق:

تفسیر برہان میں تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا شریک بنانا، حضرت رسالت مآبؐ کی نبوت کا انکار کرنا اور حضرت علیؑ کی ولایت کا انکار کرنا ایسے گناہ ہیں جو انسان کی تمام نیکیوں کو باطل کر دیتے ہیں اور اَحاطَتۡ

[1] خیر البریۃ: تمام مخلوق سے بہتر اور افضل۔

بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں اوران کے لئے دائمی جہنم ہے۔ حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا: علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ خواہ کس قدر بڑا ہی کیوں نہ ہو اور علیؑ کے دشمن سے محبت ایسا گناہ ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ خواہ کتنی ہی بڑی ہو۔ پس اس کا بدلہ اس کو دنیا میں مال ورزق وتندرستی سے دیا جائے گا اور آخرت میں اس کا عذاب دائمی ہوگا۔

علیؑ کی ولایت کا منکر جنت کو نہ دیکھے گا۔ مگر اس قدر کہ اس کی حسرت میں اضافہ ہو کہ کاش میں نے علیؑ کی ولایت کا انکار نہ کیا ہوتا تو مجھے یہ مکان نصیب ہوتا۔ اسی طرح علیؑ کا محبّ دوزخ کو اسی قدر ہی دیکھے گا کہ اس کی خوشی میں اضافہ ہو اور سمجھے کہ اگر میں ولایتِ علیؑ سے دور ہوتا تو مجھے یہ سزا بھگتنی پڑتی۔ حضورؐ نے فرمایا: اے شیعانِ علیؑ جنت تم سے فوت نہ ہوگی۔ اگرچہ بعض بداعمالیوں کی وجہ سے دیر سے پہنچو گے۔ پس اس کے درجات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا آپؐ کے اور حضرت علیؑ کے محبّ بھی دوزخ میں جاسکتے ہیں؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا: ہاں جس کی روح گناہوں کی میل اور احکام شرعیہ کی مخالفت کے غبار سے آلودہ ہوگی اس کو دوزخ کی آگ سے صاف کیا جائے گا۔ پھر اُن کے پاس بلند مرتبہ شیعانِ علیؑ کو بھیج کر بلا لیا جائے گا اور وہ ان کو دوزخ کی آگ سے اس طرح چن لیں گے جس طرح پرندہ دانہ چن لیا کرتا ہے۔ پس جن لوگوں کے گناہ معمولی اور ہلکے ہوں گے۔ وہ دنیا میں بادشاہانِ وقت اور حکامِ زمانہ کی سختیوں اور جسمانی تکلیفوں اور بیماریوں کی وجہ سے گناہوں کا بدلہ دے کر صاف ستھرے قبر میں داخل ہوں گے اور بعض کو گناہوں کی بدولت قبل از وقت موت دی جائے گی۔ حالت نزع سخت ہوگی۔ پس گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اگر گناہ زیادہ ہوئے تو موت کا اضطراب بڑھ جائے گا۔ عبادت کرنے والے کم ہوں گے اور ذلت کی موت سے مرے گا۔ پس گناہوں کا کفارہ

ہوگا اور اگر پھر بھی بچ گئے تو قبر میں لحد تک پہنچتے پہنچتے کفارہ ہوجائے گا اور اگر اس سے بھی بچ گئے تو عرصاتِ قیامت (قیامت کے میدان) کی سختی سے کفارہ ہوجائے گا۔ اگر اس کے گناہ اس سے بھی زیادہ ہوئے تو دوزخ کے اُوپر کے طبقے میں داخل کیا جائے گا۔ جس کو بعد میں سفارش سے نکالا جائے گا۔ ہمارے محبوّں میں سے سب سے زیادہ گناہ گار کا عذاب یہ ہوگا ورنہ اکثر کی سزا اس سے پہلے ختم ہوجائے گی۔ یہ لوگ ہمارے شیعہ نہیں بلکہ ہمارے محبّ ہیں اور ہمارے دوستوں کے دوست اور ہمارے دشمنوں کے دشمن ہیں۔ ہمارے شیعہ تو وہ ہیں جو صحیح معنوں میں ہمارے نقش قدم پر چلیں۔

شیعہ اور محبّ میں فرق کی مزید وضاحت کے لیے درج ذیل احادیث نقل کی جاتی ہیں:

1. ایک شخص نے ایک مرتبہ حضرت امام حسن علیہ السلام سے عرض کی کہ حضورؑ میں آپؑ کے شیعوں میں سے ہوں تو آپؑ نے فرمایا: اے خدا کے بندے اگر تو ہمارے اوامر ونواہی میں ہمارے حکم کا پابند ہے تو تیرا دعویٰ سچا ہے ورنہ اس قدر بلند مرتبہ کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنے گناہوں کو چھوڑ دے اور اِس حالت میں شیعہ نہ کہلاؤ بلکہ یہ کہو کہ میں آپؑ کا محبّ و موالی ہوں اور آپؑ کے دشمنوں سے بیزار ہوں اور یہ تمہارے لئے بہتر اور خوب ہے۔

2. ایک شخص نے حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام سے عرض کی کہ میں آپؑ کے خالص شیعوں میں سے ہوں۔ تو آپؑ نے فرمایا: اے بندۂ خدا کیا تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے درجہ پر فائز ہے۔ اللہ نے تو اپنے خلیل کو کہا ہے: وَ اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰھِیۡمَ اِذۡ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ۔ اگر تیرا دل حضرت ابراہیمؑ کے دل کی طرح ہے تو بے شک تو ہمارا شیعہ ہے ورنہ تو فالج یا جذام کا مستحق ہے تاکہ تیرے اس جھوٹ

کا کفارہ ہو۔

3. حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی موجودگی میں ایک شخص نے دوسرے پر فخر کرتے ہوئے کہا کہ میں تجھ سے بہتر ہوں کیونکہ میں محمدؐ وآلِ محمدؐ کا شیعہ ہوں۔ آپؑ نے اپنے پاس بلا کر فرمایا کہ تو اپنے مال کو اپنے اوپر خرچ کرنا پسند کرتا ہے یا اپنے مومن بھائیوں پر خرچ کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اُس نے عرض کی کہ اپنے اوپر خرچ کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں تو آپؑ نے فرمایا: پھر تو ہمارا شیعہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہم تو اپنا مال اپنی ذات پر خرچ کرنے سے اپنے دوستوں پر خرچ کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بس تم لوگ ہمارے محبّ کہلایا کرو اور ہماری محبت کی وجہ سے نجات کی امید رکھو۔

4. حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے سامنے ذکر ہوا کہ ایک شخص بازار میں بولی پر کپڑے بیچتا ہے اور اعلانیہ شیعہ بھی کہلاتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا اس کے شیعہ کہلانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو سلمانؓ، مقدادؓ اور ابوذرؓ کی مثال سمجھتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جو شخص خرید و فروخت میں دھوکا کرے اور بکنے والی چیز کے عیب خریدار سے پوشیدہ رکھے یا اجنبی گاہک کے سامنے شئے کی بولی بڑھا دے تاکہ اس کو قیمت زیادہ ادا کرنی پڑے اور اُس کے چلے جانے کے بعد بولی کم کر دے تو ایسا شخص سلمانؓ و ابوذرؓ کی مثل کیسے ہو سکتا ہے۔ بس اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ محبّ محمدؐ و آل محمدؐ ہونے کا دعویٰ کرے اور یہ کہ ان کے دوستوں کا دوست اور ان کے دشمنوں کا دشمن کہلاتا رہے۔

خلاصہ

☆ قرآن کی اس واضح آیت ”کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے شیعہ تھے“ کے باوجود بھی شیعہ کے خلاف ہر دور میں پروپیگنڈا کی انتہا کردی گئی۔

حالانکہ سورۃ النحل 16 آیت 123 میں حضورؐ کو حکم دیا گیا ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اِنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا: وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ۔ اگر اللہ کے نزدیک لفظ شیعہ قابل مذمت ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ قرار نہ دیا جاتا۔

☆ معتبر اہل سنت والجماعت مفسرین کے مطابق اس آیت وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ سے مراد حضرت ابراہیمؑ کا آذر کے گروہ سے ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ حضرت نوحؑ کے گروہ یعنی ان کے طریقہ پر چلنے والے ہونا ثابت ہے۔

☆ تفسیر برہان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت: وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ کی تاویل میں منقول ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے سامنے سے پردے اٹھائے گئے اور ملکوت سماویہ کی ان کو سیر کرائی گئی۔ پھر انہیں عرش کے پہلو میں انوار محمدؐ و آل محمدؐ اور شیعان حیدر کرار کے انوار کا تعارف کروایا گیا۔ اُس وقت حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی۔ اے اللہ: اِنَّ مِنْ شِیْعَۃِ عَلِیٍّ بے شک مجھے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے شیعوں میں سے قرار دے۔

جب انہوں نے عرض کی کہ حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں کی نشانیاں کیا

ہوں گی تو جواب ملا:

(i) 51 رکعت یومیہ نماز (ii) بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا۔

(iii) رکوع سے پہلے قنوت پڑھنا۔ (iv) دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا۔

(v) بعض روایات میں زیارت اربعین کا پڑھنا مذکور ہے۔

☆ قرآن میں شیعہ سے مراد جماعت، گروہ، فرقہ، تابعدار، طریقہ پر چلنے والے، امّت اور قوم لیا گیا ہے۔ گزشتہ انبیاء کی امتیں شیعہ کہلاتی تھیں۔ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ قرار دیا۔ قرآن میں 11 مقامات میں لفظ شیعہ استعمال ہوا ہے پھر ہم شیعہ کہلوانے میں کیوں نہیں فخر کرتے۔

☆ لغت میں شیعہ کے معنی گروہ، پیروکار، محبّ، مددگار کے ہیں۔ شِیْعَۃُ الرَّجُلِ (بِالْکَسْرِ) اِتْبَاعُہٗ وَاَنْصَارُہٗ شیعہ کسی شخص کے پیروکار اور مددگار کو کہتے ہیں۔ وَقَدْ غَلَبَ ھٰذَا الْاِسْمُ عَلٰی کُلِ مَنْ یَّتَوَ لّٰی عَلِیًّا وَ اَھْلَ بَیْتِہٖ حَتّٰی صَارَ لَھُمْ اِسْمٌ خَاصًّا ''یہ نام (شیعہ) غالب آ گیا ہے ہر اس آدمی پر جو حضرت علیؑ اور ان کے اہل بیتؑ سے محبت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔''

☆ حضرت ابوبصیر نے حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ تمہیں یہ نام مبارک ہو۔ راوی کہتا ہے میں نے عرض کی حضور وہ کونسا نام؟ تو آپؑ نے فرمایا کہ شیعہ۔ میں نے عرض کی کہ لوگ تو ہمیں اس نام کا طعنہ دیتے ہیں آپؑ نے فرمایا تم نے خداوند کریم کا یہ فرمان نہیں پڑھا وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرَاھِیْمَ۔

☆ لفظ شیعہ کی اصطلاح حضورؐ کے زمانے میں حضرت رسالت مآبؐ نے خود حضرت

علی علیہ السلام کے پیروکاروں کے لیے استعمال کی۔ لہذا محبان حضرت علیؑ کے لیے اس لفظ کے موجد اور بانی خود پیغمبر اکرمؐ ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے۔ کہ تحقیق ہم حضورؐ کے پاس بیٹھے تھے پس حضرت علی علیہ السلام آئے پس نبی کریمؐ نے فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تحقیق یہ علیؑ اور اس کے شیعہ روز قیامت ضرور کامیاب اور نجات پانے والے ہوں گے۔

واضح رہے کہ عالم اسلام کے مخالفین نے شیعہ کو بدنام کرنے کے لیے عبداللہ بن سباء نامی یہودی کا کردار متعارف کروایا۔ علماء امامیہ اور شیعان حیدر کرار اسے لعنتی اور ملعون سمجھتے ہیں۔

پیغمبرؐ کے زمانہ میں آنحضرتؐ کے خاص خاص صحابہؓ کو شیعہ کہا جاتا تھا۔ چار افراد اس لقب کے حامل تھے۔ ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، مقدادؓ اور عمار یاسرؓ۔

☆　شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بیان سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

(i) شیعہ مذہب کی ابتداء من حیث الجماعت 37 ہجری میں ہوئی ورنہ من حیث الاعتقاد والاصول تو ابتدائے خلقت سے مذہب شیعہ چلا آ رہا ہے۔

(ii) ابتدائے اسلام میں اہل سنت والجماعت شیعہ لقب سے مشہور تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے لیے اہل سنت الجماعت کا نام خود ہی وضع کر لیا۔

☆　روز قیامت صرف شیعان حیدر کرار ہی نجات یافتہ اور جنتی ہوں گے۔ جب یہ آیت: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ۔ نازل ہوئی تو رسولؐ اللہ نے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے خطاب کیا اور فرمایا کہ یَـــا

عَلِیٌّ ھُوَ اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ تَاتِیْ اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ رَاضِیْنَ مَرْضِیْنَ

یا علیؑ آیت مبارکہ میں خیر البریہ سے تم اور تمہارے شیعہ مراد ہیں روز قیامت تم اور تمہارے شیعہ اس حالت میں آؤ گے کہ خدا تم سے راضی ہوگا اور تم بھی خدا سے راضی وخوش ہوگے۔

☆ ایک شخص نے ایک مرتبہ حضرت امام حسن علیہ السلام سے عرض کی کہ حضورؑ میں آپؑ کے شیعوں میں سے ہوں تو آپؑ نے فرمایا: اے خدا کے بندے اگر تو ہمارے اوامر ونواہی میں ہمارے حکم کا پابند ہے تو تیرا دعویٰ سچا ہے ورنہ اس قدر بلند مرتبہ کا دعویٰ کرنے کے بعد اپنے گناہوں کو چھوڑ دے اور اِس حالت میں شیعہ نہ کہلاؤ بلکہ یہ کہو کہ میں آپؑ کا محبّ وموالی ہوں اور آپؑ کے دشمنوں سے بیزار ہوں اور یہ تمہارے لئے بہتر اور خوب ہے۔

ایک شخص نے حضورؐ سے سوال کیا کہ کیا آپؐ کے اور حضرت علیؑ کے محبّ بھی دوزخ میں جاسکتے ہیں؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا: ہاں جس کی روح گناہوں کی میل اور احکام شرعیہ کی مخالفت کے غبار سے آلودہ ہوگی اس کو دوزخ کی آگ سے صاف کیا جائے گا۔ پھر اُن کے پاس بلند مرتبہ شیعانِ علیؑ کو بھیج کر بلا لیا جائے گا اور وہ ان کو دوزخ کی آگ سے اس طرح چن لیں گے جس طرح پرندہ دانہ چن لیا کرتا ہے۔

حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا: علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی گناہ (دائمی) نقصان نہیں پہنچاتا۔ خواہ کس قدر بڑا ہی کیوں نہ ہو اور علیؑ کے دشمن سے محبت ایسا گناہ ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ خواہ کتنی ہی بڑی ہو۔

خود آزمائی

1. حضرت ابراہیم علیہ السلام کس کے شیعہ کے تھے قرآن مجید کی آیت کا حوالہ بھی دیں؟
2. حضور اکرمؐ کو کس نبی کے طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا آیت حوالہ بھی دیں؟
3. آپ کیسے ثابت کریں گے کہ وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِ بْرٰھِیْمَ میں "ھو" کی ضمیر کا مرجع آذر نہیں ہے اور آپ کا شمار آذر کے گروہ سے نہیں ہوتا؟
4. حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟
5. جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے سے پردے ہٹائے گئے اور انہیں ملکوت سماویہ کی سیر کرائی گئی تو انہوں نے عرش کے پہلو میں کیا دیکھا کتاب کا حوالہ دیں؟
6. جب حضرت ابراہیمؑ نے عرش کے پہلو میں انوار مقدسہ کو دیکھا تو آپؑ نے کیا دعا کی؟
7. قرآن میں لفظ شیعہ کتنے مقامات پر آیا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں کم از کم دو آیت کا حوالہ دیں؟
8. کیا گزشتہ انبیاءؑ کی امتیں شیعہ کہلاتی تھیں قرآن کا حوالہ دیں۔
9. فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِہٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّہٖ سورۃ القصص آیت 15 کیا مراد ہے پورا واقعہ بیان کریں؟
10. لفظ شیعہ کے لغوی معانی بیان کرتے ہوئے لغت کا حوالہ دیں؟

11. لفظ شیعہ کے اصطلاحی معنی کیا ہیں کتب کا حوالہ دیں؟

12. محبان حضرت علی علیہ السلام کے لیے لفظ شیعہ کے موجد اور بانی کا بتائیں اور کتاب کا حوالہ بھی دیں؟

13. اہل سنت والجماعت کے عالم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نزدیک صحابہ کرامؓ، مہاجرین اور انصار کی ایک بڑی جماعت کس لقب سے مشہور تھی کتاب کا حوالہ بھی دیں؟

14. صاحبانِ اہل سنت والجماعت نے اپنے لیے یہ لقب کیوں اختیار کیا کتاب کا حوالہ دیں؟

15. قرآن مجید، تفاسیر، احادیث اور تواریخ کی روشنی میں ثابت کریں کہ روز قیامت عالم اسلام کا کون سا فرقہ نجات یافتہ ہوگا؟

16. اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُالْبَرِیَّۃِ میں خَیْرُالْبَرِیَّۃِ سے کیا مراد ہے؟

17. شیعہ اور محبّ میں کیا فرق ہے وضاحت کریں؟